تدبر
لاہور

جاری کردہ مولانا امین احسن اصلاحیؒ

مدیر عبداللہ غلام احمد

یکے از مطبوعات:

ادارہ تدبر قرآن وحدیث

رحمان سٹریٹ، مسلم کالونی، محسن آباد، لاہور، پاکستان

ای میل: tadabbur@hotmail.com

قرآنِ حکیم

ترجمہ : مولانا امین احسن اصلاحیؒ
حواشی : مولانا خالد مسعود

خصوصیات:
★ فکرِ فراہی کی روشنی میں قرآن حکیم کا پہلا ترجمہ
★ نفیس کتابت ★ سفید زمین اور رنگین حاشیے کے ساتھ عمدہ طباعت ★ مضبوط جلد
قیمت : سٹینڈرڈ ایڈیشن -/550 روپے ، حمائل ایڈیشن -/396 روپے

فاران فاؤنڈیشن
122۔ فیروز پور روڈ۔ اچھرہ، لاہور۔ 54600 فون 042-7595200

حیاتِ رسولِ امیؐ

تصنیف : مولانا خالد مسعود

خصوصیات:
کتب سیرت میں پائی جانے والی اختلافی روایات کا محاکمہ
قرآن مجید میں بیان کردہ فرائض واحوال رسول اللہ ﷺ پرمبنی سیرت کی منفرد کتاب
رسول امیؐ کے بارے میں سابقہ کتب کی پیشینگوئیوں پر سیر حاصل تبصرہ
★ حواشی اور ضروری حوالے ★ عام فہم سلیس زبان ★ خوبصورت جلد
★ صفحات 600 ★ قیمت -/375 روپے

دارالتذکیر رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

تدبّر لاہور

جاری کردہ
مولانا امین احسن اصلاحی

مُدیر:
عبداللہ غلام احمد

شمارہ 84
جون 2004ء
ربیع الآخر 1425ھ

مجلس ادارت

◆ محبوب سُبحانی
◆ سعید احمد
◆ سید اسحاق علی
◆ نعمان علی

قیمت 15.00 روپے
سالانہ 60.00 روپے
بیرونِ ملک 400.00 روپے
(ماسوائے برصغیر)

فہرست

تذکرہ وتبصرہ
روشن خیالی / محبوب سبحانی 2
تدبر قرآن
تفسیر سورہ بقرہ
حمید الدین فراہیؒ / ڈاکٹر عبید اللہ فراہی 7
تدبر حدیث
درس صحیح بخاری۔ کتاب الاستقراض کی روایات
امین احسن اصلاحیؒ / سید اسحاق علی 16
درس موطا امام مالک۔ کتاب الجہاد
امین احسن اصلاحیؒ / سید اسحاق علی 25
مقالات
قرآن کا فلسفہ تاریخ /
پروفیسر عبدالخالق فاروقی 37
صورتانی / محبوب سبحانی 44
مراسلہ ومذاکرہ
اسلام اور جمہوریت / امین احسن اصلاحی 47
تبصرہ کتب
مقالات اصلاحی (جلد دوم) / احسان عارف 53

ناشر: ادارہ تدبر قرآن وحدیث رحمان سٹریٹ، مسلم کالونی، سمن آباد، لاہور

محبوب سبحانی

روشن خیالی

اسلامی جمہوریہ پاکستان کے صدر جنرل پرویز مشرف بارہا اس عزم کا اظہار کر چکے ہیں کہ پاکستان کو ایک روشن خیال ملک بنایا جائے گا۔ ان کے اتباع میں دوسرے رہنما بھی اس عزم وارادہ کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خیال میں یہ روشنی کہاں سے آئے گی۔ اس کے دو ہی ذرائع ہیں ایک مغربی افکار ونظریات اور ان کی تہذیب وتمدن کی روشنی ہے۔ دوسری وحی الٰہی کی روشنی ہے۔ ان دونوں روشنیوں کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

مغربی افکار ونظریات کی روشنی کی چند بنیادی خصوصیات ہیں:۔

مذہب نجی معاملہ ہے:

مغربی فکر وفلسفہ دنیا کے کسی خالق کو نہیں جانتا۔ اس کے نزدیک دنیا ایک حادثہ کے نتیجہ میں وجود میں آئی اور بے جان مادہ کے ارتقاء سے انسان متشکل ہوا۔ اس لیے مغربی تہذیب اجتماعی طور پر خدا کے وجود کو تسلیم نہیں کرتی، لیکن وہ اس کا صاف طور پر انکار بھی نہیں کرتی۔ خدا کو تسلیم کرنے میں اس کو کوئی مادی فائدہ نظر نہیں آتا۔ چونکہ مغربی معاشرہ میں عیسائیت اور دوسرے مذاہب کے اثرات ہیں اس لیے اس نے مذہب کے معاملہ میں مفاہمت کر لی ہے اور اس کو ہر شخص کا نجی معاملہ قرار دے دیا ہے۔ اس طرح اس نے خدا کو گھر اور کلیسا میں بند کر دیا ہے اور باہر کی دنیا سے اس کو بے دخل کر دیا ہے۔

مغرب کا حقیقی معبود:

مغربی معاشرہ کا حقیقی معبود عیش وتنعم ہے۔ مغرب کا ایک عام آدمی خواہ وہ جمہوری ہو یا فاسشٹ، سرمایہ دار ہو یا کمیونسٹ، مزدور ہو یا دانشور صرف ایک مثبت مذہب کو جانتا ہے یعنی وہ مادی ترقی کی پرستش کرتا ہے جس کا عقیدہ ہے کہ زندگی کو آسان سے آسان اور آرام دہ سے آرام دہ بنایا جائے۔ اس مذہب کے مندر بڑے بڑے کارخانے، بنک، سائنسی لیبارٹریاں، ایٹمی تنصیبات، بائیڈرو الیکٹرک ورکس، سینما، ہوٹل، رقص گاہیں اور اسٹیڈیم ہیں ان کے پجاری صنعت کار، بینکر، سائنس دان، انجینئر، فلم اسٹار اور بڑے بڑے کھلاڑی ہیں۔

ان کی زندگی کا فلسفہ طاقت کی خاطر طاقت کا حصول ہے جس کا حال ہی میں مظاہرہ عراق اور

افغانستان میں دیکھنے میں آیا ہے۔

زندگی معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا:

مغربی فلسفیوں کا کہنا ہے کہ چونکہ ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ انسانی زندگی کی ابتدا کیسے اور کیونکر ہوئی اور مرنے کے بعد کیا ہوگا۔ سائنسی تجربات اور حسابیات سے بھی یہ معمہ حل نہیں کیا جا سکتا اس لیے زندگی صرف دنیاوی زندگی ہے اور یہ مادی زندگی ہے۔ چنانچہ بہتر یہی ہے کہ اپنی تمام توانائیاں مادی اور عقلی ترقی پر صرف کی جائیں اور اس راہ میں آسمانی اخلاقیات اور اخلاقی مفروضوں کو مزاحم نہ ہونے دیا جائے۔

نئی اخلاقیات:

اس فکر وفلسفہ کی روشنی میں مغرب کی سماجی زندگی میں نئی اخلاقیات پیدا ہوئی ہے جو مفادِ عامہ کی اخلاقیات کہلاتی ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ جس چیز سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو مادی فائدہ پہنچے وہ صحیح ہے اس لیے معاشرہ کی مادی خوشحالی پر اثر انداز ہونے والی تمام اقدار فنی مہارت وغیرہ کو مبالغہ کی حد تک فروغ دیا جا رہا ہے جب کہ وہ تمام بنیادی اقدار جن کی خالص اخلاقی بنیاد تھی مثلاً اولاد کی محبت، جنسی وفاداری تیزی سے اپنی اہمیت کھو رہی ہیں کیونکہ ان سے معاشرہ کو کوئی مادی فائدہ نہیں پہنچتا۔ اس طرح معاشرہ میں خیر وشر کا اعلیٰ ترین معیار مادی کامیابی اور ناکامی بن گیا ہے۔

خاندانی نظام:

مغربی معاشرہ بنیادی طور پر فنی معاشرہ بن چکا ہے جس سے خاندانی نظام شکست وریخت کا شکار ہے۔ خاندان کو معاشرہ کی بنیادی اینٹ بھی کہا جاتا تھا، لیکن اب یہ اینٹ ٹوٹ پھوٹ رہی ہے۔ پہلے گروپ اور قبیلہ کی فلاح وبہبود کے لیے مضبوط خاندانی رشتوں کو فیصلہ کن حیثیت حاصل تھی اب ان کی جگہ اجتماعی ادارے لے رہے ہیں۔ خاندانی رشتے اتنے کمزور پڑ گئے ہیں کہ والدین اور اولاد کے تعلقات کی کوئی خاص سماجی اہمیت نہیں رہی۔ جب تک باپ بیٹا معاشرہ کے معروف کی حدود نہ پھلانگیں اس وقت تک معاشرہ ان سے کوئی تعرض نہیں کرتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مغربی باپ کا بیٹے پر اختیار بہت کمزور پڑ گیا ہے اور بیٹے نے باپ کو عزت واحترام سے تقریباً محروم کر دیا ہے۔ اس طرح والدین اور اولاد کے تعلقات معدوم ہوتے جا رہے ہیں اور فنی معاشرہ کے مطالبات میں ضم ہوتے جا رہے ہیں۔ اس معاشرہ میں فرد کے فرد پر اختیار کو ختم کرنے کا رجحان ہے جس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ خاندانی رشتوں کی ذمہ داریوں کو بھی ختم کر دیا جائے۔

جنسی وفاداری:

جدید مغربی معاشرہ میں جنسی وفاداری اور ڈسپلن تیزی سے قصہ ماضی بنتا جا رہا ہے کیونکہ اس ڈسپلن کا معاشرہ کی مادی ترقی اور خوشحالی پر کوئی اثر نہیں اس لیے اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس کی جگہ نئی اخلاقیات نے لے لی ہے جس کے مطابق انسان کو اپنے جسم پر اختیار مطلق حاصل ہے اس کے استعمال میں اس کو پوری آزادی ہے کہ وہ اپنے جسم کو جیسے اور جس طرح چاہے استعمال کرے صرف معاشرہ کا قانون ہی اس کی راہ میں مزاحم ہو سکتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں بہت سے پیچیدہ مسائل پیدا ہو گئے ہیں جن میں سنگل پیرنٹس کا مسئلہ بھی ہے جس سے بچے والدین کی شفقت و محبت سے محروم ہو گئے ہیں۔ یہ بچے جذباتی اور نفسیاتی پیچیدگیوں کے ساتھ جوان ہوتے ہیں۔ انہیں عمر بھر شناخت کا مسئلہ پریشان رکھتا ہے۔ جذباتی طور پر ناآسودہ رہنے کی وجہ سے یہ معاشرہ کے لیے متعدد مسائل پیدا کرتے ہیں۔

غرضیکہ مغربی معاشرہ اس دنیا کو دارالامتحان نہیں بلکہ دارالانعام سمجھتا ہے اس کا خیال ہے کہ وہ اپنی ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کے بہترین استعمال سے دنیا کو جنت بنا سکتا ہے اور سائنسی ترقی سے خود کائنات کا آقا بن سکتا ہے۔ جہاں تک خدا کے وجود اور انسان کی روحانی اور اخلاقی اقدار کا تعلق ہے تو وہ مفلس کا چراغ بن چکی ہے۔

وحی الٰہی کی روشنی

خیال کو منور کرنے کے لیے حقیقی روشنی وحی الٰہی سے حاصل ہوتی ہے۔ اس کی بعض بنیادی خصوصیات درج ذیل ہیں:

تخلیق کائنات بامقصد ہے:

یہ دنیا حادثہ کے نتیجہ میں وجود میں نہیں آئی بلکہ خدائے علیم و قدیر اور حی و قیوم نے اس کو پیدا وار میں ایک خاص مقصد اور ایک خاص منصوبہ کے تحت پیدا کیا ہے۔ وہی اس کو چلا رہا ہے۔ خدا ایک بدیہی حقیقت ہے جو صرف گھر اور مسجد میں نہیں ہے بلکہ وہ ہر جگہ موجود ہے۔ بازاروں، درس گاہوں، دفتروں، کارخانوں، اسمبلیوں اور زندگی کے ہر شعبہ میں موجود ہے۔ اس لیے اس کو پرائیویٹ معاملہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا ہے اور اس کو دنیا میں اپنا خلیفہ بنایا ہے۔ یہ ذمہ

داری ادا کرنے کے لیے اس کو قوتیں اور صلاحیتیں عطا کی ہیں۔ زندگی کوئی معمہ نہیں ہے بلکہ یہ خالق کائنات نے عطا کی ہے پھر وہی موت دے گا اور دوبارہ بھی وہی اٹھائے گا۔ اسی نے آسمان و زمین کی چیزوں کو پیدا کیا اور ان کو انسان کی خدمت میں لگا رکھا ہے۔ اسی نے انسان کے اوپر ہر قسم کی نعمتیں پوری کی ہیں۔ یہ نعمتیں ظاہری و مادی بھی ہیں اور عقلی اور روحانی بھی۔ شکل و صورت، قد و قامت، ہاتھ پاؤں، غذا، لباس اور اس قبیل کی دوسری تمام چیزیں بھی اس کی بخشی ہوئی ہیں اور سمع و بصر، عقل و ادراک اور بصیرت و ہدایت کی نعمتیں بھی اسی کی عطا کردہ ہیں تو جب تمام نعمتوں کا بخشنے والا اللہ ہی ہے تو بندے کی تمام شکر گزاری و نیاز مندی کا حق دار بھی وہی ہوا۔ اس لیے انسان کا فرض ہے کہ وہ منعم حقیقی کا شکر ادا کرے اور اسی کی عبادت کرے وہی معبود حقیقی ہے۔

دارالامتحان اور دارالانعام:

دنیا دارالانعام نہیں بلکہ دارالامتحان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو مال و منال اور جسمانی اور عقلی صلاحیتیں اور قابلیتیں عطا کی ہیں وہ اس کی امانت ہیں۔ انسان مختار کل نہیں کہ اپنی قابلیتوں کو جس طرح چاہے استعمال کرے بلکہ جس کی یہ امانت ہیں اسی کی منشا کے مطابق استعمال کرنا انسان کے لیے لازم ہے۔ یہی اس کا امتحان ہے۔ قیامت کے دن اسی کے متعلق پرسش ہوگی جن لوگوں نے امانت کا حق ادا کیا ہوگا انہیں انعام میں جنت ملے گی اور جنہوں نے خیانت کی ہوگی انہیں سزا کے طور پر دوزخ میں جانا ہوگا۔ اس لیے خیر و شر کا اعلیٰ ترین معیار اخروی کامیابی اور ناکامی ہے۔

کائنات میں انسان کی حیثیت:

انسان جانوروں کی طرح صرف جسمانی وجود نہیں رکھتا بلکہ روحانی اور اخلاقی وجود بھی رکھتا ہے۔ وہ شتر بے مہار نہیں ہے بلکہ اخلاقی حدود و قیود کا پابند ہے اس لیے اخلاقیات کو وحی الٰہی کے ذریعے مبرہن کر دیا گیا ہے اور اس کا شعور انسان کی فطرت میں بھی ودیعت کر دیا گیا ہے۔

معاشرے میں خاندان کی اہمیت:

خاندان معاشرہ کی بنیادی اینٹ ہے۔ اس اینٹ کے مضبوط اور درست ہونے سے معاشرہ مضبوط ہوگا اور درست سمت میں ترقی کرے گا۔ خاندان کے دو اہم ستون ہیں ایک والدین اور اولاد کا رشتہ اور دوسرا زن و شوہر کے تعلقات۔

وحی الٰہی کے ذریعہ بتایا گیا ہے کہ خدا اور رسول کے بعد سب سے بڑا حق والدین کا ہے۔ ماں کا

حق باپ سے تین گنا ہے۔ اولاد پر والدین کی اطاعت وفرمانبرداری اور عزت واحترام ہر حال میں لازم ہے۔ والدین پر محبت اور شفقت کے ساتھ اولاد کی بہترین تعلیم وتربیت کی ذمہ داری ہے تاکہ وہ اچھا مسلمان بن کر اسلامی معاشرہ کا اچھا فرد بن سکے۔

میاں بیوی کے درمیان محبت ومودت کا رشتہ ہے اس تعلق کا بنیادی مقصد نسل انسانی کی بقا ہے۔ دونوں پر جنسی وفاداری لازمی ہے جو فریق بھی بدکاری کا مرتکب ہوگا وہ سزا کا مستحق ہوگا۔

صلہ رحمی:

عزیزوں اور رشتہ داروں کے حقوق بھی متعین کر دیے گئے ہیں۔ رحمی رشتوں کی بڑی اہمیت ہے۔ان رشتوں کو کاٹنے والوں کے لیے سخت وعید ہے۔

ان دو روشنیوں کے موازنے کے بعد یہ فیصلہ آسانی سے کیا جاسکتا ہے کہ اسلامی مملکت کو روشن خیالی کے لیے کس روشنی کی ضرورت ہے۔

قد افلح من زکّٰھا

تزکیہ نفس (کامل)

مولانا امین احسن اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ

دنیاو آخرت میں کامیابی کے لیے ایک جامع لائحہ عمل جس میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کے حوالے سے انسانی نفس کی اصلاح وتربیت کے لیے قرآن وسنت کی روشنی میں عملی رہنمائی فراہم کی گئی ہے۔

قیمت:285روپے

ملنے کا پتہ

فاران فاؤنڈیشن 122۔ فیروز پور روڈ۔ اچھرہ، لاہور

دارالتذکیر رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

علامہ حمید الدین فراہیؒ/ترجمہ: ڈاکٹر عبید اللہ فراہی

تفسیر سورہ بقرہ

۔۱۰۔

تیسرا مقام۔ ذٰلِکَ الْکِتَابُ لَا رَیْبَ فِیْہِ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ کے بیان میں:

یعنی اس کتاب کو محض دعوی اور اس کی تاکید سے شروع کرنے اور دلیل کے معاملہ میں سکوت اختیار کرنے کی حکمت، ہم بیان کر چکے ہیں کہ قرآن مجید کا منزل من اللہ ہونا اس کے مخاطبین کے سامنے بالکل واضح تھا، لیکن اس پر ایمان لانے سے جو چیز ان کو روک رہی تھی وہ ایک تو ان کی غفلت تھی دوسری قبولیت حق کی بنیادی صفت جو کہ اس کے لیے شرط لازم کا حکم رکھتی ہے ان کے اندر سے مفقود ہو چکی تھی۔ اصل یہ ہے کہ جو بات روز روشن کی طرح عیاں ہو اسے ثابت نہیں کیا جاتا کیوں کہ وہ دلیل سے زیادہ واضح ہوتی ہے بلکہ اس پر غور وفکر کی دعوت دی جاتی ہے، فکر ونظر کے لوازم کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے، شبہات کا ازالہ کیا جاتا ہے اور غفلت کے نتائج اور واضح حق کو چھوڑ دینے کے انجام سے ڈرایا جاتا ہے۔

چنانچہ "ذلک الکتاب" کے الفاظ نے کھلے ہوئے حق کو ان کے سامنے لاکر کھڑا کر دیا ہے اور "لا ریب فیہ" نے اس کے غایت درجہ واضح ہونے کا اعلان کر دیا ہے اور اس طرح ان کو آگاہی دے دی ہے کہ جو اس کا منکر ہو اسے خود اپنے نفس کی حالت پر غور کرنا چاہیے جس کے اندر یقینی طور پر مرض سرایت کر گیا ہے جو حق کی معرفت رکھنے کے باوجود اسے تسلیم کرنے سے روک رہا ہے بلکہ سرے سے معرفت حق ہی کی راہ میں رکاوٹ بن گیا ہے جیسا کہ قرآن میں بہت سی جگہوں پر آیا ہے۔

اس کے بعد "ھدی للمتقین" کے الفاظ لاکر ایک تو قرآن مجید کے ایک جامع وصف کی طرف متوجہ کیا ہے جیسا کہ پندرھویں فصل میں ہم نے پانچویں مطالع کے تحت واضح کیا ہے کہ ھدی ہی کا دوسرا نام نور، بینہ، فرقان، میزان، صراط اور سرچشمہ ہدایت ہے۔ اس لیے اپنے تعارف کے لیے وہ کسی دوسری چیز کا محتاج نہیں بلکہ دوسری چیزوں کی معرفت کا ذریعہ ہے۔ چنانچہ "ھدی للمتقین" کہہ کر اس نے اپنی معرفت حاصل کرنے کا طریقہ بتایا ہے جس طرح آپ کسی چیز کے بارے میں خبر دیتے ہیں کہ وہ خوش ذائقہ، خوبصورت، ملائم اور خوشبودار ہے یا وہ پیاس کو بجھانے والی ہے یا یہ کہ اس میں شفا ہے تو ان صفات

کے ذریعہ اپنے مشاہدہ کی بنا پر آپ اس کو پہچاننے کا طریقہ بتا دیتے ہیں۔ قرآن مجید نے اس حقیقت کو بہت سی جگہوں پر بیان کیا ہے اور ان میں سے بعض کا ذکر ہم چوتھے مقام کے تحت کریں گے۔

دوسرے یہ الفاظ اس چیز کی طرف بھی متوجہ کر رہے ہیں جو حقائق کی معرفت کے لیے بنیادی شرط کا حکم رکھتی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ حصول معرفت فکر و نظر کو کام میں لانے کے ساتھ مشروط ہے، کیونکہ حق کتنا ہی واضح کیوں نہ ہو اس کے لیے مشاہدہ اور توجہ ضروری ہے۔ اس امر کی طرف بہت سی آیات سے اشارہ کیا گیا ہے۔ مثلاً:

اِنَّ فِی ذٰلِکَ لَعِبرَۃً لِّاُولِی الاَبصَارِ (سورہ آل عمران:۱۳، سورہ نور:۴۴)

﴿بے شک ان کے اندر اہل نظر کے لیے بڑا سامان عبرت ہے۔﴾

ایک اور جگہ پر ہے:

نُفَصِّلُ الآیاتِ لِقَومٍ یَّعقِلُون (روم:۲۸)

﴿ہم اپنی نشانیوں کی وضاحت کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل کو کام میں لاتے ہیں۔﴾

دوسری جگہ ہے:

اِنَّ فِی ذٰلِکَ لَآیاتٍ لِّقَومٍ یَّتَفَکَّرُونَ. (رعد:۳، روم:۲۱، زمر:۴۲، جاثیہ:۱۳)

﴿بے شک ان چیزوں کے اندر نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔﴾

نیز یہ آیت بھی:

اِنَّ فِی ذٰلِکَ لَآیاتٍ لِّقَومٍ یَّسمَعُونَ (یونس:۶۷، روم:۲۳)

﴿بے شک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو بات کو سنتے ہیں۔﴾

اس قسم کے اشارات قرآن مجید میں متعدد مقامات پر آئے ہیں۔ ان کو یہاں پیش نہ کر کے اصل بات کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے اور وہ ہے تقویٰ اس لیے کہ فکر و نظر کے صحیح استعمال کی شرط یہ ہے کہ ارادہ اور نیت کو درست کیا جائے اور نیت کی درستگی اس بات پر موقوف ہے کہ دل میں تقویٰ اور خیر کی طرف رغبت ہو کیوں کہ متکبر یا خواہشات نفس میں ڈوبا ہوا شخص کبھی حق بات کی طرف متوجہ نہیں ہوتا خواہ وہ کتنی ہی واضح اور کھلی ہوئی کیوں نہ ہو جیسا کہ فرمایا ہے:

اِنَّ فِی اختِلَافِ الَّیلِ وَالنَّھارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰہُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالاَرضِ لَآیاتٍ لِّقَومٍ یَّتَّقُونَ. (یونس:۶)

﴿بے شک رات اور دن کی آمد و شد اور آسمانوں اور زمین میں اللہ کی مخلوقات کے

اندر بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو خوف رکھتے ہیں۔﴾

یہ ایک جانی بوجھی اور مشاہداتی حقیقت ہے کہ غافل اور متکبر انسان جب حق کے پاس سے گزرتا ہے تو اس سے نظریں پھیر لیتا ہے اور جب اسے حق کی طرف بلایا جاتا ہے تو اس سے کترانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسے لوگوں کا ذکر قرآن میں بہت جگہ آیا ہے۔ ایک آیت میں ہے:

وَکَاَیِّن مِّن آیَۃٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَالاَرضِ یَمُرُّونَ عَلَیھَا وَھُم عَنھَا مُعرِضُونَ. (یوسف:۱۰۵)

﴿اور آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے یہ گزرتے ہیں تو ان سے منہ موڑے ہوئے رہتے ہیں۔﴾

دوسری جگہ ہے:

قَد کَانَت آیَاتِی تُتلٰی عَلَیکُم فَکُنتُم عَلٰی اَعقَابِکُم تَنکِصُونَ مُستَکبِرِینَ بِہٖ سَامِرًا تَھجُرُونَ. (مومنون:۶۶-۶۷)

﴿ہماری آیتیں تم کو سنائی جاتی تھیں تو تم پیچھے کی طرف مڑ جاتے تھے اس سے انکبار کرتے ہوئے گویا کسی افسانہ گو کو چھوڑ کر جا رہے ہو۔﴾

چوتھا مقام۔ قرآن مجید کی معرفت کے لیے مشاہدہ اور تجربہ کا جو اصول ہم نے بیان کیا ہے وہ وہی ہے جس کی صراحت قرآن نے کی ہے:

پیش نظر رہے کہ لفظ "ھدیٰ" سے ہم نے جس بات پر استدلال کیا ہے وہ وہی ہے جسے قرآن نے پوری صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ نیز اس راہ کے موانع پر اپنی تنبیہات، ازالہ شبہات اور ان کے علاوہ دوسری باتوں کو بھی حسب موقع اس میں شامل کر لیا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید اپنے اوپر ایمان لانے کے لیے لوگوں سے صرف اس امر کا مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس پر غور کریں اس میں ذہن و فکر کو لگائیں۔ اس کی باتوں کو غور سے سنیں اور سمجھیں اور جو دو ٹوک فیصلہ، بہترین بات، کھلی ہدایت اور دلنشین دلائل وہ ان کے سامنے لا رہا ہے اس سے یاد دہانی حاصل کریں، ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن ان باتوں کی تصریحات سے بھرا پڑا ہے۔ یہاں ان میں سے بعض کے ذکر پر ہم اکتفا کریں گے۔ مثلاً فرمایا ہے:

اَفَلَا یَتَدَبَّرُونَ القُرآنَ اَم عَلٰی قُلُوبٍ اَقفَالُھَا اِنَّ الَّذِینَ ارتَدُّوا عَلٰی اَدبَارِھِم مِّن بَعدِ مَا تَبَیَّنَ لَھُمُ الھُدَی الشَّیطَانُ سَوَّلَ لَھُم وَ اَملٰی لَھُم (محمد:۲۴-۲۵)

﴿ کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے یا دلوں پر تالے چڑھے ہوئے ہیں بے شک جو لوگ بعد اس کے کہ ہدایت ان پر واضح ہو چکی تھی پیٹھ پیچھے مڑ گئے شیطان نے ان کو فریب دیا ہے اور اس نے انہیں ڈھیل دے دی ہے۔ ﴾

کتابٌ انزلناہُ الیکَ مبارکٌ لِیدّبّرُوْا آیاتہٖ ولیتذکّرا اُولوا الالباب. (ص:۲۹)

﴿ یہ ایک بابرکت کتاب ہے جو ہم نے تمہاری طرف اتاری ہے تاکہ لوگ اس کی آیات پر غور کریں اور صاحبِ عقل اس سے یاد دہانی حاصل کریں۔ ﴾

فبشّرْ عبادِ الّذین یستمعُوْنَ القَوْلَ فیتّبعُوْنَ احسنہٗ اُولٰئک الّذین ھداھُمُ اللّٰہُ و اولٰئک ھم اُولُوا الالباب. (زمر:۱۷۔۱۸)

﴿ سو میرے ان بندوں کو خوشخبری پہنچا دو جو بات کو توجہ سے سنتے ہیں اور اس میں سے خوب تر کی پیروی کرتے ہیں۔ یہی ہیں جن کو اللہ نے ہدایت بخشی ہے اور یہی ہیں جو عقل والے ہیں۔ ﴾

قدْ بیّنّا لکُم الآیاتِ لعلّکُمْ تعقلُوْن (حدید:۱۷)

ہم نے تمہارے لیے آیتوں کو کھول کر بیان کیا ہے تاکہ عقل سے کام لو۔ ﴾

فمالِ ھٰؤلاءِ القَوْمِ لا یکادُوْنَ یفقھُوْنَ حدیثا. (نساء:۷۸)

﴿ ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ کوئی بات سمجھنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ ﴾

افلَمْ یدّبّرُوا القَوْلَ ام جاءَ ھُم مالَم یاتِ آباءَ ھُمُ الاوّلین. ام لَم یعرِفُوا رَسُولَھُم فھُمْ لَہٗ مُنکِرُوْن. ام یقُولُون بہٖ جنّۃٌ بل جاءَ ھُمْ بالحقِّ و اکثرُھُم لِلحقِّ کارھُون. ولو اتّبعَ الحقُّ اھواءَ ھُمْ لفسدتِ السّمٰوٰتُ والارضُ ومَنْ فیھِنّ بل اتیناھُم بذکرِھِمْ فھُمْ عنْ ذِکرِھِم مُعرِضُون. ام تسالُھُمْ خرْجاً فخراجُ ربِّکَ خیرٌ" وّھُوَ خیرُ الرّازِقین. و انّکَ لتدعُوھُم اِلٰی صراطٍ مُّستقیم و انّ الّذینَ لا یُؤمِنُونَ بالآخرۃِ عنِ الصّراطِ لناکِبُوْن. (المومنون:۶۸۔۷۴)

﴿ کیا انہوں نے اس کلام پر غور نہیں کیا یا ان کے پاس ایسی چیز آئی جو ان کے اگلے آباء و اجداد کے پاس نہیں آئی یا انہوں نے اپنے رسول کو پہچانا نہیں اس لیے اس

کے منکر ہو گئے ہیں یا وہ کہتے ہیں کہ اسے جنون لاحق ہے بلکہ وہ ان کے پاس حق لے کر آیا ہے لیکن ان میں سے اکثر حق کو ناپسند کرنے والے ہیں اور اگر حق ان کی خواہشات کے تابع ہوتا تو تمام آسمان و زمین اور جو کچھ ان میں ہیں سب تباہ ہو جاتے بلکہ ہم تو ان کے پاس ان کے حصہ کی یاد دہانی لائے ہیں تو ۱۰۰ اپنی یاد دہانی سے اعراض کر رہے ہیں کیا تم ان سے کچھ محصول مانگ رہے ہو تمہارے رب کا دیا صلہ سب سے بہتر ہے۔ اور وہ بہترین روزی بخشنے والا ہے اور بے شک تم ان کو ایک سیدھے راستہ کی طرف بلا رہے ہو اور جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ سیدھی راہ سے ہٹے ہوئے ہیں۔ ﴾

اس آخری ٹکڑے میں ان بہت سی باتوں پر متنبہ کیا ہے جو صحیح فکر اور تدبر میں مانع ہوتی ہیں، نیز ان سب کی اصل کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے اور وہ ہے حق کو ناپسند کرنا اور پھر حق کو ناپسند کرنے کا سبب یہ بتایا ہے کہ وہ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے جو اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے دل تقویٰ سے یکسر خالی ہیں کیوں کہ جو شخص عدل پسند ہوتا ہے ضروری ہے کہ وہ جزا پر ایمان لائے اور جزاء آخرت پر ایمان نہ لانا ہی غفلت، حق سے اعراض، شہوت میں انہماک اور عدم تقویٰ کا باعث ہوتا ہے۔

پانچواں مقام۔ خود حق کے ذریعہ حق کی طرف بلانا اور فکر و تدبر پر ابھارنا زیادہ قرین عقل، زیادہ واضح، زیادہ دل نشیں اور زیادہ کارگر ہوتا ہے:

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے اور نتائج بھی اس پر شاہد ہیں اس وجہ سے کہ علماء راسخین نے اسے قبول کرنے میں پہل کی ہے۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر لوگوں کو کسی ایسی چیز سے مخاطب کرتا جس پر ان کی عقل شہادت نہ دیتی تو ایک تو کوئی معجزہ دکھائے بغیر ان پر حجت ہی پوری نہ ہوتی۔ اس وقت وہ معجزہ حجت ہوتا نہ کہ وہ چیز جس سے ان کو مخاطب کیا گیا ہے۔ دوسرے سابقین کا ایمان لانا ایک طرح کی غلطی ہوتی اور ایک ایسی چیز پر یقین کر لینا شمار ہوتا جو ثابت ہی نہ کی جا سکی ہو۔ تیسرے ایمان لانے کے لیے معجزہ طلب کرنا قابلِ ملامت نہ ہوتا جب کہ ان کو معجزہ کا مطالبہ کرنے اور حق صریح کا انکار کر دینے پر ملامت کی گئی ہے اور جھڑکی سنائی گئی ہے اور یہ بات بالکل ثابت ہے کہ ان کا معجزہ طلب کرنا محض مکابرت اور انکارِ حق کی وجہ سے تھا کیوں کہ معجزات کے ظاہر ہو جانے کے بعد بھی وہ ایمان نہیں لائے۔ اس سلسلہ میں بہت سی آیات آئی ہیں یہاں ان میں سے بعض کے ذکر پر ہم اکتفا کریں گے۔ فرمایا ہے:

وَ اقسمُوْا باللّٰہِ جھدَ ایمانھِمْ لئنْ جاءَتْھُمْ آیۃٌ" لّیُؤمِنُنّ بھا قُلْ اِنّما

الآیاتُ عِندَ اللّٰہِ وَمَا یُشعِرُکُمْ اَنَّھَا اِذَا جَآءَ تْ لَا یُؤمِنُوْنَ . وَ نُقَلِّبُ اَفْئِدَتَھُم وَ اَبْصَارَھُمْ کَمَا لَمْ یُؤمِنُوا بِہٖ اَوَّلَ مَرَّۃٍ وَّنَذَرُھُمْ فِی طُغیَانِھِمْ یَعْمَھُوْنَ. وَلَو اَنَّنَا نَزَّلْنَا اِلَیھِمُ المَلٰٓئِکَۃَ وَ کَلَّمَھُمُ المَوْتٰی وَ حَشَرْنَا عَلَیھِمْ کُلَّ شَیْءٍ قُبُلًا مَّا کَانُوا لِیُؤمِنُوا اِلَّا اَنْ یَّشَاءَ اللّٰہُ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَھُمْ یَجْھَلُوْنَ. (انعام: ۱۰۹۔۱۱۱)

﴿اور وہ اللہ کی پکی قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ اگر ان کے پاس کوئی نشانی آئی تو وہ ضرور اس پر ایمان لائیں گے کہہ دو کہ نشانیاں تو اللہ ہی کے پاس ہیں اور تمھیں کیا پتہ کہ جب وہ آجائے گی تو وہ ایمان لے ہی آئیں گے اور ہم ان کے دلوں اور ان کی نگاہوں کو الٹ دیں گے جس طرح وہ پہلی مرتبہ ایمان نہیں لائے اور ان کو ان کی سرکشی میں بھٹکتا ہوا چھوڑ دیں گے اور اگر ہم ان کی طرف فرشتے بھی اتار دیتے اور مردے بھی ان سے باتیں کرنے لگتے اور ساری چیزیں ان کے آگے گروہ در گروہ اکٹھا کر دی جاتیں تو بھی یہ ایمان لانے والے نہ تھے الا یہ کہ اللہ کی مرضی ہوتی لیکن ان کی اکثریت جہل میں مبتلا ہے۔﴾

اسی طرح انجیل میں بھی حضرت عیسیٰ کی طرف سے یہود کو ان کے معجزہ طلب کرنے پر سخت پھٹکار سنائی گئی ہے۔ متی کی انجیل ۱۶:۴ میں ہے:

''اس زمانہ کے برے اور زنا کار لوگ نشان طلب کرتے ہیں مگر یوناہ (یونس) کے نشان کے سوا کوئی اور نشان ان کو نہ دیا جائے گا اور وہ ان کو چھوڑ کر چلا گیا۔''

اس کی وجہ یہ ہے کہ حق صریح کا منکر کبھی بھی کسی نشانی یا معجزہ پر ایمان نہیں لاتا۔ چنانچہ حجت پوری کرنے، حق کو ثابت کرنے اور رب کی طرف دعوت دینے کا سب سے اقرب اور زیادہ قرین عقل طریقہ یہی تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب کو ایسا بنا کر پیش کرے کہ لوگ اس پر بغیر کسی واسطہ کے ایمان لائیں کیوں کہ اس کے اندر خود اتنی چمک، روشنی اور دلوں کے لیے شفا ہے کہ اسے ماننے کے لیے کسی سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔ عقل راسخ اور قلب سلیم رکھنے والے اس کے اندر اسی خوبی کو دیکھ کر ایمان لاتے رہے ہیں اور آج بھی وہ اس میں اسی وصف کو پا رہے ہیں۔

رہی یہ بات کہ قرآن خود اپنے آپ میں ایک معجزہ ہے تو یہ چیز اس حقیقت کی تردید نہیں کرتی بلکہ اس کی تائید کرتی ہے کیوں کہ کلام کے اندر جب حق کی روشنی اور قاہرانہ شان ہوتی ہے وہ بھی ایسی

عقلوں کو مبہوت اور جن و انس کو اس کا مثل پیش کرنے سے عاجز کر دے تو وہ کلام وضاحت و بیان، اتمام حجت اور رد باطل کی صفت میں اور بلند پایہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وہ روشنی کے اوپر روشنی اور طاقت کے اوپر مزید طاقت کا حامل بن جاتا ہے جس طرح کسی ایک معاملہ پر بہت سی پچی شہادتیں اکٹھا ہو جائیں۔

اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ قرآن مجید کا منزل من جانب اللہ ہونا اپنے معجزہ ہونے کا محتاج نہیں بلکہ اس کا کتاب الٰہی ہونا بالکل ظاہر و بین ہے کیوں کہ اس میں روشنی، دل کا اطمینان، پاکیزگی اور طہارت ہے جس طرح اللہ کی تمام نازل کردہ کتابوں میں ہے۔ البتہ وہ ان صفات میں حد اعجاز کو پہنچ گیا ہے جو اس کی باتوں کو موکد اور اس پر سے ہر شک کو دور کر رہا ہے۔ آیت ذیل:

وَ اِنْ کُنْتُمْ فِی رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوا بِسُوْرَۃٍ مِّنْ مِّثْلِہٖ.

(بقرہ: ۲۳)

﴿اگر تم اس کے متعلق شک میں مبتلا ہو جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے تو لاؤ اسی طرح کی ایک سورہ۔﴾

میں اسی جانب اشارہ ہے جیسا کہ عنقریب اسی سورہ میں آئے گا۔

اگر کوئی یہ کہے کہ مخالفین کے لیے یہ کوئی مسکت دلیل نہیں ہے تو ہم کہیں گے کہ کیا عصا کو سانپ میں تبدیل کر دینے، پانی کو خون بنا دینے، کھٹملوں اور مینڈکوں میں بہتات پیدا کر دینے اور کوڑھیوں اور اندھوں کو شفایاب کر دینے وغیرہ جیسے خوارق میں سے کسی بھی معجزے نے مخالفین کا منہ بند کر دیا تھا، کیا انھوں نے نہیں کہا کہ یہ محض سحر و کید ہے؟

لیکن جہاں تک فکر و نظر کے استعمال کی دعوت دینے کا معاملہ ہے تو یہ طریقہ عدل و انصاف اور آزادوں کو خطاب کرنے کے پہلو سے زیادہ اولیٰ و انسب ہے تاکہ جو بات ان کے سامنے واضح ہو چکی ہے اس پر ایمان لائیں۔ اسی سے مخالف کو خاموش بھی کیا جا سکتا ہے جیسا کہ حضرت ابراہیم نے اپنے راست استدلال سے بادشاہ وقت کو خاموش کر دیا تھا "فَبُھِتَ الَّذِی کَفَرَ۔ (سورہ بقرہ: ۲۵۸)" (تو وہ کافر سن کر بھونچکا رہ گیا) اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی قوم کے مقابل حجت عطا کی تو آپ نے ان پر پوری کر دی میں نے کوئی چیز حق بات سے بڑھ کر دلوں میں اتر جانے والی نہیں پائی پھر آپ اس کلام کے متعلق کیا خیال رکھتے ہیں جو لفظ و معنی ہر دو پہلو سے معجزہ ہو اور اس باب میں حد کمال کو پہنچا ہوا ہو؟ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن حجت ہے اور حجت ہونے میں بھی معجزہ ہے چنانچہ اس جیسی کوئی حجت نہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ قرآن نے لوگوں کو حق کی طرف بلایا اور انتہائی واضح الفاظ میں اسے ان کے

سامنے پیش بھی کر دیا تاکہ وہ حق کی تقلید کے راستہ سے نہیں بلکہ خود اسی کے معرفت اسے پہچان لیں اور قرآن کو قرآن ہی سے سمجھیں نہ کہ کسی اور چیز سے۔ اس سے زیادہ بلند مرتبہ اور اس سے آگے کوئی منزل نبوت اور ہدایت کے حق کی ادائگی کی ہو ہی نہیں سکتی۔ قرآنی اعجاز کی اسی خصوصیت کی طرف رسول اللہ ﷺ کے اس قول میں اشارہ ہے:

ما من الانبیاء من نبی الا اعطی من الایات ما مثلہ آمن علیہ البشر. و انما کان الذی اوتیتہ و حیا اوحی اللہ الی فارجوا ان اکون اکثرھم تابعا یوم القیامۃ۔

(بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب کیف نزل الوحی واول ما نزل، نیز کتاب الاعتصام)

﴿ہر نبی کو معجزات میں سے کوئی نہ کوئی معجزہ ملا جس کو دیکھ کر لوگ ایمان لائے لیکن مجھ کو جو چیز ملی وہ وحی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے میری طرف نازل فرمایا تو مجھے امید ہے کہ میرے پیرو قیامت کے دن تمام انبیاء کے پیروؤں سے زیادہ ہوں گے۔﴾

قول نبوی ''ما مثلہ آمن علیہ البشر'' کا مطلب ہے کہ کچھ ہی معجزات پر لوگ ایمان لائے کیوں کہ واقعہ یہ ہے کہ ان کی امت کے لوگ نہ تو ہر معجزہ پر ایمان لائے اور نہ سبھی کو ایمان کی دولت نصیب ہوئی۔ چنانچہ ''مثل'' سے آپ کی مراد وہ بڑے معجزات ہیں جن پر ایمان لانے والے ایمان لائے اور انما کان الذی اوتیت سے آپ نے وہ نشانی یا معجزہ مراد لیا ہے جس پر آپ کی امت کے اکثر لوگ ایمان لائیں گے۔ باقی دوسرے معجزات یا تو انکار کرنے والوں پر اتمام حجت کے لیے یا اہل ایمان کے لیے تائید اور مدد کے طور پر آئے ہیں اور ارجو ان اکون اکثرھم تابعا کہنے کا یہ مطلب نکلتا ہے کہ:

۱۔ یہ معجزہ چوں کہ دعوت کے مقاصد پر بنفس نفیس دلالت کر رہا ہے اس لیے وہ اپنے آپ میں ایک مکمل حجت ہے۔

۲۔ راسخ ذہنوں کو وہ اپنی طرف متوجہ کرنے والا ہے۔ چنانچہ عام لوگ اپنے ان علماء کے پیچھے پیچھے اس کی طرف خود بخود کھنچے چلے آئیں گے۔

۳۔ یہ آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دینے والی بجلی کی طرح نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی دوسری تمام نشانیوں کی طرح مستقل باقی رہنے والا معجزہ ہے۔ چنانچہ نسلاً بعد نسل لوگ اس پر ایمان لاتے رہیں گے۔

۴۔ بعد میں آنے والے بھی اپنے سابقین ہی کی طرح اس سے روشنی پر ہوں گے۔

۵۔ بلکہ مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ اس کی حجت اور اس پر اعتماد میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ ایک تو اس وجہ سے کہ علماء اس پر متفق ہوں گے اور برابر اس میں غور و خوض کرتے رہیں گے دوسرے اس وجہ سے اگلوں کی شہادت بعد والوں کے لیے جاری اور قائم رہے گی۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ لوگ اس کا مثل پیش کرنے سے ہمیشہ عاجز رہیں گے، چوتھی یہ کہ لوگوں کو دن بدن اس کا تجربہ ہوتا جائے گا کہ احوال و معاملات میں فرق اور تبدیلی پیدا ہو جانے کے باوجود یہ ایسا معجزہ ہے جو ان کی فلاح کا ضامن اور ان کو ترقی کے مدارج طے کرانے کا ذریعہ اور وسیلہ ہے۔ پانچویں وجہ یہ ہے کہ وہ ہر طرح کے تغیر و تبدل سے ہمیشہ محفوظ رہے گا جب کہ پچھلے آسمانی صحیفے بہت کم مدت محفوظ رہ سکے۔

۔جاری ہے۔

تدبر قرآن

۹ جلدوں میں مکمل تفسیر قرآن

مولانا امین احسن اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ

★ فکر فراہی و اصلاحی کی اہم ترین دستاویز اور خزینۂ معارف
★ کتاب الٰہی کے علم و حکمت کو الفاظ، جملوں، آیات، مجموعہ آیات، سورتوں اور سورتوں کے گروپوں کی سطح پر سمجھنے سمجھانے کے لیے
★ نظم و نظام قرآن کی اساس پر تفسیری لٹریچر میں گراں قدر اضافہ
★ سلف صالحین کے اصولوں پر جدید اسلوب میں
★ عہد نو کے تقاضوں کے عین مطابق

صفحات 6074 ، قیمت : 2952 روپے

ملنے کا پتہ
فاران فاؤنڈیشن 122۔ فیروز پور روڈ۔ اچھرہ، لاہور
دارالتذکیر رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

مولانا امین احسن اصلاحی

درس صحیح بخاری

(کتاب الاستقراض کی روایات)

۱۵. بابُ: مَنْ اَخَّرَ الْغَرِيمَ اِلَى الْغَدِ اَوْ نَحْوِهِ وَلَمْ يَرَ ذٰلِكَ مَطْلًا

وَقَالَ جَابِرٌ "اشْتَدَّ الْغُرَمَاءُ فِي حُقُوقِهِمْ فِي دَيْنِ اَبِي فَسَاَلَهُمُ النَّبِيُّ ﷺ اَنْ يَقْبَلُوا ثَمَرَ حَائِطِي فَاَبَوْا فَلَمْ يُعْطِهِمِ الْحَائِطَ، وَلَمْ يَكْسِرْهُ لَهُمْ قَالَ سَاَغْدُو عَلَيْكَ غَدًا فَغَدَا عَلَيْنَا حِيْنَ اَصْبَحَ فَدَعَا فِي ثَمَرِهَا بِالْبَرَكَةِ فَقَضَيْتُهُمْ.

یہ باب اس بارے میں ہے کہ کسی نے قرض خواہ کو ایک آدھ دن کے لیے ٹالا تو یہ مطل (ٹال مٹول) میں شمار نہیں ہوگا۔ حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ میرے باپ کے ذمہ قرض کے معاملہ میں قرض خواہوں نے اپنے حقوق کے لیے بڑی سختی کی تو نبی ﷺ نے ان سے کہا کہ وہ میرے باغ کا پھل قبول کرلیں تو انہوں نے انکار کیا۔ نبی ﷺ نے نہ ان کو باغ دیا اور نہ اس میں کوئی کمی بیشی کی اور کہا کہ میں صبح کو آؤں گا۔ دوسرے دن آپ تشریف لائے اور باغ کے پھلوں کے لیے برکت کی دعا کی تو میں نے ان کا قرض ادا کردیا۔

وضاحت:

اوپر ذکر آیا ہے کہ 'مطل الغنی ظلم' یعنی جو صاحب مال ہے اس کی طرف سے ٹال مٹول بہت بڑا ظلم ہے۔ ظلم کہنے سے یہ بات نکلتی ہے کہ اگر اس کی تعزیر کی جائے تو عدالت کرسکتی ہے۔ اب یہ باب باندھا ہے کہ اگر کوئی شخص ایک آدھ دن کے لیے ٹال مٹول کرے تو یہ ظلم نہیں ہوگا اور اس ذیل میں ایک حوالہ بھی دیا ہے کہ جابر بن عبداللہؓ کے باپ کے قرض خواہوں نے ان سے سختی کے ساتھ تقاضا کیا تو نبی ﷺ نے ان کو حضرت جابرؓ کے باغ کے پھل قبول کرنے کو کہا لیکن انہوں نے انکار کردیا۔ دوسرے دن آنحضرت ﷺ حضرت جابرؓ کے باغ میں گئے اور برکت کی دعا کی۔ اس کے بعد حضرت جابرؓ نے پھل تڑوائے اور قرض خواہوں کا قرض چکا دیا اور دوسری روایت میں اتنا بھی ہے کہ بہت کچھ ان کے پاس بچ

بھی رہا۔ امام صاحب کا مطلب اس کا حوالہ دینے سے صرف یہ ہے کہ اس میں آنحضرت ﷺ نے ایک دن کے لیے ٹالا تھا تو یہ مطل میں شامل نہیں ہوگا۔ ظاہر ہے کہ کوئی بھی ایک آدھ دن کے ٹالنے کو مطل نہیں سمجھتا۔ ٹال مٹول کا ایک خاص مطلب ہے جس کو سب سمجھتے ہیں۔

ولم یکسرہ لھم کا ترجمہ بعض لوگوں نے پھل اتروانے کا کیا ہے لیکن "کسر" کا لفظ اس کے لیے کسی طریقہ سے بھی موزوں نہیں ہے۔ میرے نزدیک یہ ہے کہ نہ تو ان کو آپ نے باغ دیا اور نہ ہی مقدار میں کمی بیشی کرکے اس معاملہ کو ختم کیا بلکہ معاملہ اگلے دن تک ملتوی کردیا۔

۱۶. بابُ مَنْ بَاعَ مَالَ الْمُفْلِسِ اَوِ الْمُعْدِمِ فَقَسَمَهُ بَيْنَ الْغُرَمَاءِ اَوْ اَعْطَاهُ حَتّٰى يُنْفِقَ عَلٰى نَفْسِهِ.

باب: اس شخص کے بارے میں جو دیوالیہ یا محتاج کا مال بیچ کر قرض خواہوں کے درمیان تقسیم کردے یا اسی کو دے دے تاکہ وہ اپنے اوپر خرچ کرے۔

۱۸۔ حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ" حَدَّثَنَا يَزِيدُ بْنُ زُرَيْعٍ حَدَّثَنَا حُسَيْنٌ الْمُعَلِّمُ حَدَّثَنَا عَطَاءُ بْنُ اَبِي رَبَاحٍ عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ اَعْتَقَ رَجُلٌ" غُلَامًا لَهُ عَنْ دُبُرٍ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ مَنْ يَشْتَرِيهِ مِنِّي فَاشْتَرَاهُ نُعَيْمُ بْنُ عَبْدِاللّٰهِ فَاَخَذَ ثَمَنَهُ فَدَفَعَهُ اِلَيْهِ.

ترجمہ:۔ حضرت جابرؓ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے اپنے مرنے کے بعد اپنے غلام کو آزاد کرنے کی وصیت کردی تو نبی ﷺ نے پوچھا کہ کون اس کو مجھ سے خریدتا ہے تو اس کو نعیم بن عبداللہ نے خرید لیا۔ نبی ﷺ نے اس کی قیمت اس شخص کو دے دی۔

وضاحت:۔ اعتق عن دبر کا مطلب یہ ہے کہ مالک نے اعلان کردیا کہ اس کے مرنے کے بعد غلام آزاد ہے۔ ایسے غلام کو اصطلاح میں مدبر کہتے ہیں۔

جب تک دوسری تمام روایات کی روشنی میں نہ سمجھیں یہاں اس روایت کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ بہت بڑی مشکل ہے۔ آنحضرت ﷺ اپنے صحابہ کا حال جانتے تھے۔ آپ کو علم تھا کہ ان حضرت کے پاس بے کچھ نہیں اور غلام کو مدبر کر چکے ہیں تو آپ نے غلام کو بیچ دیا یعنی اس کے مدبر ہونے کی حیثیت کو ختم کردیا اور رقم ان کو دے دی کہ اپنے اوپر خرچ کریں اور کوئی قرض ہے تو ادا کردیں۔ فدفعہ الیہ کے معنی یہ ہیں کہ مال ان کو دے دیا۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ جب تک مدبر آزاد نہ ہوا ہو اس کے بارے میں

مدبر کرنے والا اپنی رائے بدل سکتا ہے اور کہہ سکتا ہے کہ اب میرے حالات اس کی اجازت نہیں دیتے۔ جب آنحضرت ﷺ نے ایسا کیا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ وعدہ ایسا نہیں ہے کہ ٹل نہ سکے۔ یہ غلامی کا ایک مسئلہ ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہم ان مصیبتوں سے بری ہو گئے اور اب دنیا کا غلامی کی طرف پلٹنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

۱۷. بَابُ: إِذَا أَقْرَضَهُ إِلَى أَجَلٍ مُسَمًّى أَوْ أَجَّلَهُ فِي الْبَيْعِ

قَالَ ابْنُ عُمَرَ فِي الْقَرْضِ إِلَى أَجَلٍ لَا بَأْسَ بِهِ، وَإِنْ أُعْطِيَ أَفْضَلَ مِنْ دَرَاهِمِهِ مَا لَمْ يَشْتَرِطْ وَقَالَ عَطَاءٌ وَعَمْرُو بْنُ دِينَارٍ هُوَ إِلَى أَجَلِهِ فِي الْقَرْضِ. وَقَالَ اللَّيْثُ حَدَّثَنِي جَعْفَرُ بْنُ رَبِيعَةَ عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ هُرْمُزَ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ أَنَّهُ ذَكَرَ رَجُلًا مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ سَأَلَ بَعْضَ بَنِي إِسْرَائِيلَ أَنْ يُسْلِفَهُ، فَدَفَعَهَا إِلَيْهِ إِلَى أَجَلٍ مُسَمًّى فَذَكَرَ الْحَدِيثَ.

باب: اس بارے میں کہ آدمی کوئی قرض دے دے ایک معین مدت کے لیے یا اس کو موجل کر دے تو اس بارے میں کیا ہوگا۔

ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ ایک معین مدت کے قرض دینے میں کوئی حرج نہیں ہے اور اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے کہ کسی شخص کے دیئے ہوئے درہموں سے اچھے درہم واپس ملیں اگر شرط نہ کی ہو۔ عطاء اور عمرو بن دینار کہتے ہیں کہ وہ اپنی مدت کا پابند رہے گا اور ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بنی اسرائیل کے ایک شخص کا ذکر فرمایا کہ اس نے بنی اسرائیل کے ایک دوسرے شخص سے ایک معین مدت کے لیے قرض مانگا تو اس نے دے دیا۔ پھر آپ نے پوری حدیث سنائی۔

وضاحت:

اگر کوئی شخص قرض دے اور اس کو مرحل کر دے یعنی جو قرض دیا تھا اس کی واپسی کی مدت ٹھہرا دے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یہ بات ٹھیک ہے اور ہر عاقل کے نزدیک اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور اس میں بھی کوئی حرج نہیں کہ قرض لینے والا واپس کرتے وقت اپنی طرف سے کچھ زیادہ دے۔ بحث اس وقت پیدا ہوتی ہے جب قرض دینے والا شرط لگا دے کہ. تنا دے رہا ہوں اور اتنی مدت کے بعد اتنا واپس لوں گا۔ یہ ربا ہو جائے گا۔ اس زمانے میں درہم چاندی کے سکے تھے۔ ان میں بعض زیادہ گھس

جاتے تو ان کی قیمت کم ہو جاتی۔ اس پس منظر میں قرض کی واپسی پر جھگڑے بھی پیدا ہو جاتے تھے۔ ابن عمر کا فتویٰ یہ تھا کہ قرض لینے والا اپنی خوشی سے اچھے درہم واپس کر دے تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ البتہ اگر کوئی شرط ہوگی، زبانی یا تحریری، تو وہ ربا ہوگا۔

حضرت ابوہریرہؓ نے ایک اسرائیلی کا قصہ بیان کیا کہ اس نے ایک دوسرے اسرائیلی سے قرض لیا۔ اگر یہ واقعہ ایک مسلمان کا ہوتا تب بھی درست تھا لیکن یہ بات ہے کہ سابقہ امتوں کے تمام احکام اس امت پر جاری نہیں ہو سکتے الا آنکہ آنحضرت ﷺ نے یا قرآن نے اس کو بیان کیا ہو۔ صرف تورات میں پڑھ کر ہم اس پر عمل نہیں کر سکتے۔ اس روایت میں سقم یہ ہے کہ وہ پوری حدیث نقل نہیں ہوئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کتاب پر نظر ثانی نہ ہو سکی اور روایت نقل ہونے سے رہ گئی۔

۱۸. بَابُ: الشَّفَاعَةِ فِي وَضْعِ الدَّيْنِ

باب: قرض میں کمی کرنے کے لیے سفارش کے بارے میں

۱۹۔ حَدَّثَنَا مُوسَى حَدَّثَنَا أَبُو عَوَانَةَ عَنْ مُغِيرَةَ عَنْ عَامِرٍ عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ أُصِيبَ عَبْدُاللّٰهِ وَتَرَكَ عِيَالًا وَدَيْنًا فَطَلَبْتُ إِلَى أَصْحَابِ الدَّيْنِ أَنْ يَضَعُوا بَعْضًا مِنْ دَيْنِهِ فَأَبَوْا فَأَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ فَاسْتَشْفَعْتُ بِهِ عَلَيْهِمْ فَأَبَوْا فَقَالَ صَنِّفْ تَمْرَكَ كُلَّ شَيْءٍ مِنْهُ عَلَى حِدَتِهِ، عِذْقَ ابْنِ زَيْدٍ عَلَى حِدَةٍ، وَاللِّينَ عَلَى حِدَةٍ وَالْعَجْوَةَ عَلَى حِدَةٍ، ثُمَّ أَحْضِرْهُمْ حَتَّى آتِيَكَ فَفَعَلْتُ. ثُمَّ جَاءَ ﷺ فَقَعَدَ عَلَيْهِ وَكَالَ لِكُلِّ رَجُلٍ حَتَّى اسْتَوْفَى وَبَقِيَ التَّمْرُ كَمَا هُوَ كَأَنَّهُ لَمْ يُمَسَّ وَغَزَوْتُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ عَلَى نَاضِحٍ لَنَا فَأَزْحَفَ الْجَمَلُ فَتَخَلَّفَ عَلَيَّ فَوَكَزَهُ النَّبِيُّ ﷺ مِنْ خَلْفِهِ، قَالَ بِعْنِيهِ وَلَكَ ظَهْرُهُ إِلَى الْمَدِينَةِ، فَلَمَّا دَنَوْنَا اسْتَأْذَنْتُ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ إِنِّي حَدِيثُ عَهْدٍ بِعُرْسٍ قَالَ ﷺ فَمَا تَزَوَّجْتَ بِكْرًا أَمْ ثَيِّبًا قُلْتُ ثَيِّبًا أُصِيبَ عَبْدُاللّٰهِ وَتَرَكَ جَوَارِيَ صِغَارًا، فَتَزَوَّجْتُ ثَيِّبًا تُعَلِّمُهُنَّ وَتُؤَدِّبُهُنَّ، ثُمَّ قَالَ ائْتِ أَهْلَكَ، فَقَدِمْتُ فَأَخْبَرْتُ خَالِي بِبَيْعِ الْجَمَلِ فَلَامَنِي، فَأَخْبَرْتُهُ بِإِعْيَاءِ الْجَمَلِ، وَبِالَّذِي كَانَ مِنَ النَّبِيِّ ﷺ وَوَكْزِهِ إِيَّاهُ فَلَمَّا قَدِمَ النَّبِيُّ ﷺ غَدَوْتُ إِلَيْهِ بِالْجَمَلِ فَأَعْطَانِي ثَمَنَ الْجَمَلِ وَالْجَمَلَ وَسَهْمِي مَعَ الْقَوْمِ.

ترجمہ:۔ حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ عبداللہ (ان کے والد) کی وفات ہوگئی اور انہوں نے بہت سے عیال اور قرض چھوڑا۔ میں نے قرض خواہوں سے چاہا کہ وہ لوگ ان کا قرض ذرا کم کر دیں تو انہوں نے انکار کر دیا۔ میں نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور چاہا کہ آپ ان لوگوں سے میرے بارے میں سفارش کریں لیکن اس سفارش کو ماننے سے بھی انہوں نے انکار کر دیا۔ اس پر نبی ﷺ نے فرمایا تم اپنی کھجوروں

کی قسمیں الگ الگ کرو، عذق ابن زید الگ، لین الگ اور عجوہ الگ، پھر ان لوگوں کو بلاؤ یہاں تک کہ میں آؤں۔ میں نے ایسا کیا اور رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور اس پر بیٹھ گئے۔ اور ہر ایک کا مطلوبہ کھجور ماپ دی یہاں تک کہ پورا کر دیا اور کھجور بچ رہا گویا کہ اس کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ اور (جابرؓ) کہتے ہیں کہ میں نے نبی ﷺ کے زمانے میں آپ کی معیت میں ایک اونٹ پر جہاد کیا۔ کہتے ہیں کہ اونٹ تھک گیا اور پیچھے رہ گیا۔ نبی ﷺ نے اس کو پیچھے سے کوڑے لگائے اور فرمایا کہ اسے میرے ہاتھ بیچ دو اور اجازت رہے گی کہ مدینہ تک تم اس پر سوار رہو۔ کہتے ہیں کہ جب میں (مدینہ سے) قریب ہوا تو میں نے آگے جانے کی اجازت چاہی اور بتایا کہ یا رسول اللہ میں نے نئی نئی شادی کی ہے۔ آپ نے پوچھا کہ کنواری سے کی ہے یا شوہر آشنا سے تو میں نے کہا شوہر آشنا سے کی ہے۔ عبداللہ کی شہادت ہوئی تو انہوں نے چھوٹی چھوٹی لڑکیاں چھوڑیں۔ لہٰذا میں نے شادی ایک شوہر آشنا سے کی کہ انہیں کچھ تہذیب سکھائے اور کنگھی چوٹی سکھائے۔ آپ نے مجھے اجازت دے دی کہ اہل خانہ کے پاس جاؤں کہتے ہیں کہ میں آیا اور اپنے ماموں کو خبر دی کہ میں نے اونٹ بیچ دیا ہے تو انہوں نے بڑی ملامت کی چنانچہ میں نے اونٹ کے تھک جانے اور نبی ﷺ نے جو کچھ کیا اس کا اور اسے کوڑے لگانے کا واقعہ سنا دیا۔ جابرؓ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ جب آئے تو میں ان کی خدمت میں اونٹ لے کر حاضر ہوا تو آپ نے مجھے اونٹ کی قیمت دی، اونٹ بھی دے دیا اور غنیمت میں سے دوسرے لوگوں کے حصہ کی طرح میرا حصہ بھی دے دیا۔

وضاحت:۔ باب یہ ہے کہ قرض دار کے حق میں سفارش کرنا تاکہ قرض دینے والا قرض میں کچھ کمی کر دے۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ کی اس روایت کو امام صاحب پہلے بھی کئی شکلوں میں لائے ہیں۔ حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ ان کے والد عبداللہ شہید ہوئے اور اپنے پیچھے عیال اور قرض چھوڑ گئے تو حضرت جابرؓ نے قرض خواہوں سے قرض میں کمی کی درخواست کی اور ان کے انکار پر آنحضرت ﷺ سے گزارش کی کہ وہ قرض میں کمی کی سفارش کریں، لیکن آنحضرت ﷺ کی شفاعت بھی انہوں نے نہ مانی۔ واقعہ یہ ہے کہ بڑے لعین لوگ تھے کہ آنحضرتؐ کا کہنا بھی نہ مانا۔ باب کے تحت بات تو یہیں ختم ہو جاتی ہے لیکن امام صاحب نے آگے ایک دوسری روایت بھی اس میں شامل کر دی ہے جو اس سے بالکل الگ ہے۔

یہ دوسری روایت بھی حضرت جابرؓ ہی کی ہے اور اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنے صحابہ کے بارے میں معلومات حاصل کرتے رہتے۔ جب حضرت جابرؓ نے بتایا کہ انہوں نے نئی نئی شادی کی ہے تو آنحضرت ﷺ نے کریدا کہ کنواری سے کی ہے یا ثیبہ سے۔ حضرت جابرؓ نے بتایا کہ ثیبہ سے اور یہ اس لیے کی ہے کہ ان کی چھوٹی چھوٹی بہنیں ہیں اور وہ ان کو آداب سکھائے گی اور مہذب بنائے گی۔ نبی ﷺ نے یہ سوال ان کے باطن کو ابھارنے کے لیے کیا کہ جو ہر جو چھپے ہوئے ہیں وہ خلق کے سامنے آ جائیں۔ آپ نے مدینہ پہنچ کر حضرت جابرؓ کو ان کا اونٹ بھی دے دیا اور اس کی قیمت بھی اور غزوہ

میں جو مال غنیمت ملا تھا اس میں سے حصہ بھی دے دیا۔ روایات میں آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ دینے کے لیے ایسے مواقع تلاش کرتے کہ کسی کے دل پر شاق بھی نہ گزرے اور لینے والا آسانی کے ساتھ قبول بھی کر لے۔ صحابہؓ کے جوہر کھولنے کے مواقع بھی آپ خود ہی پیدا کرتے۔

یہ تعلیم وتربیت کے وہ مقامات ہیں کہ واقعہ ہے کہ ان باتوں کو پیغمبر ہی جانتا ہے۔

۱۹۔ بَابُ: مَا يُنْهٰى عَنْ إِضَاعَةِ الْمَالِ وَقَوْلِ اللّٰهِ تَعَالٰى "وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ" وَ "لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِينَ" وَقَالَ فِي قَوْلِهِ "أَصَلٰوتُكَ تَأْمُرُكَ أَنْ نَتْرُكَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا أَوْ أَنْ نَفْعَلَ فِي أَمْوَالِنَا مَا نَشَاءُ"، وَقَالَ: "وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمْ" وَالْحَجْرِ فِي ذٰلِكَ وَمَا يُنْهٰى عَنِ الْخِدَاعِ

باب: اس بارے میں کہ مال کو ضائع کرنے سے روکا گیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا (سورہ بقرہ) اور یہ کہ مفسدوں کے عمل کو کارآمد نہیں بناتا (سورہ یونس) اور اللہ تعالیٰ نے اپنے قول میں فرمایا کہ کیا تمہاری نماز یہ حکم دیتی ہے کہ ہم ان بتوں کو جن کو باپ دادا پوجتے آئے ہیں چھوڑ دیں اور اپنے مال میں من مانا تصرف کرنا چھوڑ دیں (سورہ ہود) اور فرمایا کہ تم اپنے مال بے وقوفوں کے حوالے مت کرو۔ نیز اس بارے میں پابندی لگانے کا اور دھوکا دینے کی ممانعت کا بیان۔

وضاحت:۔ حجر کے معنی پابندی کے ہیں۔ ایک شخص اگر دیوالیہ ہو جائے تو قاضی اس پر پابندی عاید کر کے اس کو اپنے مال میں تصرف کرنے سے روک سکتا ہے تاکہ اس طرح اولیاء کے حقوق کنٹرول میں رہیں اور کسی بے وقوفی سے مال ضائع نہ ہو جائے۔ ایسے شخص کو حجر کیا جا سکتا ہے یعنی پابند کیا جا سکتا ہے۔

۲۰۔ حَدَّثَنَا أَبُو نُعَيْمٍ حَدَّثَنَا سُفْيَانُ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ دِينَارٍ سَمِعْتُ ابْنَ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ قَالَ رَجُلٌ لِلنَّبِيِّ ﷺ إِنِّي أُخْدَعُ فِي الْبُيُوعِ فَقَالَ إِذَا بَايَعْتَ فَقُلْ لَا خِلَابَةَ فَكَانَ الرَّجُلُ يَقُولُهُ.

ترجمہ:۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ میں لین دین میں بہت دھوکا کھا جاتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ جب تم لین دین کرو تو کہہ دیا کرو کہ لا خلابة (کوئی دھوکا نہیں ہوگا) تو یہ شخص اس طرح کہتا تھا۔

وضاحت:۔ سوال یہ ہے کہ لا خلابة کوئی ضابطہ ہے کہ جس کو پڑھ کر کوئی شخص دھوکہ کھانے سے بچ جاتا ہے۔ میرے نزدیک یہ خیار فی البیع کی ایک شکل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب آپ نے کہہ دیا کہ لا

خلابہ تو گویا کہ آپ نے چیز لے لی لیکن یاد رہے کہ اگر اس میں کوئی خرابی معلوم ہوئی یا دھوکہ معلوم ہوا تو بعد میں آپ کو واپس کرنے کا حق ہے۔ یہ وہی چیز ہے جو بیع خیار میں ہوتی ہے یعنی بیع حتمی نہیں ہے بلکہ خیار کے ساتھ مشروط ہے۔ اب یہ ہے کہ خیار کی شکل مختلف چیزوں میں مختلف ہوگی۔ ایک مکان آپ خریدیں گے تو ظاہر ہے کہ ایک دو دن نہیں بلکہ ایک دو مہینے میں اندازہ ہوگا کہ کیسا ہے، پڑوس کیسا ہے وغیرہ۔ ایک بکری کے لیے دو تین دن اندازہ لگانے کے لیے خاصے ہیں کہ دودھ ہے کہ نہیں یا یوں ہی تھن پھیلا دیا گیا تھا۔ بکری کے معاملہ میں حکم بھی ہے کہ جو دودھ استعمال کیا تھا اس کے بدلے میں اتنے دانے دے دیئے جائیں اور اسی پر دوسری چیزوں کے بارے میں قیاس کیا جاسکتا ہے کہ بدلہ کیا ہوگا۔ بہرحال یہ سب کچھ معروف پر ہوگا۔ لا خلابۃ سے مطلب یہ ہوگا کہ اگر کوئی دھوکہ ثابت ہوا تو مال واپس کردیا جائے گا۔

۲۱۔ حَدَّثَنَا عُثْمَانُ حَدَّثَنَا جَرِيرٌ " عَنْ مَنْصُورٍ عَنِ الشَّعْبِيِّ عَنْ وَرَّادٍ مَوْلَى الْمُغِيرَةِ بْنِ شُعْبَةَ عَنِ الْمُغِيرَةِ بْنِ شُعْبَةَ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ إِنَّ اللَّهَ حَرَّمَ عَلَيْكُمْ عُقُوقَ الْأُمَّهَاتِ وَوَأْدَ الْبَنَاتِ، وَمَنَعَ وَهَاتِ، وَكَرِهَ لَكُمْ قِيلَ وَقَالَ، وَكَثْرَةَ السُّؤَالِ وَإِضَاعَةَ الْمَالِ.

ترجمہ:۔ مغیرہ بن شعبہ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ماؤں کی حق تلفی، لڑکیوں کے زندہ دفن کرنے اور منع وھات کو تم پر حرام کیا ہے اور قیل وقال، کثرت سوال اور رضاعت مال کو تمہارے لیے ناپسند فرمایا ہے۔

وضاحت:۔ امام صاحب اس روایت کو رضاعت مال کے باب میں لائے ہیں۔ مضمون یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مال میں اسراف یا فضول خرچی کو ناپسند فرمایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مال زندگی کا نظام قائم رکھنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اس کو ضائع کرکے آدمی اپنے لیے مصائب ومشکلات کو دعوت دیتا ہے لیکن حدیث دوسرے کئی اہم مضامین پر بھی مشتمل ہے۔

جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے ان میں ماں کی حق تلفی اور اس سے تعلق توڑنا سرفہرست ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بعد بندوں کے حقوق میں والدین اور والدین میں بھی ماں کا حق مقدم ہے۔ قرآن مجید اور حدیث میں ماں کا حق باپ کے حق سے تین گنا زیادہ بتایا گیا ہے لہٰذا اگر کوئی نالائق اولاد ماں کی بے قدری کرتی ہے تو اس کا گناہ بھی بہت بڑا ہے۔ معصوم بچیوں کو زندہ درگور کرکے مار ڈالنا بعض عربوں کے ہاں ایک قبیح رسم تھی۔ وہ غیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے یا مالی مشکلات سے بچنے کے لیے بچیوں کے ساتھ یہ وحشیانہ سلوک کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو بھی بڑے گناہوں میں شمار کیا۔ منع وھات ترکیب کے لحاظ سے منعِ وھات ہونا چاہیے۔ یعنی ایک ہاتھ سے تو روکا اور دوسرے

ہاتھ سے مانگا۔ مراد واجب طریقہ سے اپنی ادائیگی نہ کرنا لیکن دوسروں کا مال جائز وناجائز طریقوں سے حاصل کرنا ہے۔ ایسا کرنا حرام ہے۔

قیل وقال سے مراد بے مقصد بحث ومناظرہ میں الجھنا اور اعتراضات پیدا کرنا ہے۔ کثرت سوال کا مقصد بھی اصل معاملہ کو وضاحتوں میں الجھا دینا ہوتا ہے جس سے دینی امور گرفت سے نکل جاتے ہیں۔ یہودیوں نے اسی کثرت سوال کے باعث اپنے لیے شریعت کو مشکل بنا لیا تھا۔ یہ تمام باتیں بھی اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہیں۔

۲۰۔ بَابُ: اَلْعَبْدُ رَاعٍ فِي مَالِ سَيِّدِهِ وَلَا يَعْمَلُ إِلَّا بِإِذْنِهِ

باب: اس بارے میں کہ غلام اپنے آقا کے مال کا نگران ہے اور اس میں کوئی تصرف وہ اس کے اذن کے بغیر نہیں کرسکتا۔

۲۲۔ حَدَّثَنَا أَبُو الْيَمَانِ أَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ " عَنِ الزُّهْرِيِّ قَالَ أَخْبَرَنِي سَالِمُ بْنُ عَبْدِاللَّهِ عَنْ عَبْدِاللَّهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا أَنَّهُ سَمِعَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: كُلُّكُمْ رَاعٍ وَمَسْئُولٌ " عَنْ رَعِيَّتِهِ فَالْإِمَامُ رَاعٍ وَهُوَ مَسْئُولٌ " عَنْ رَعِيَّتِهِ وَالرَّجُلُ فِي أَهْلِهِ رَاعٍ وَهُوَ مَسْئُولٌ " عَنْ رَعِيَّتِهِ وَالْمَرْأَةُ فِي بَيْتِ زَوْجِهَا رَاعِيَةٌ " وَهِيَ مَسْئُولَةٌ " عَنْ رَعِيَّتِهَا وَالْخَادِمُ فِي مَالِ سَيِّدِهِ رَاعٍ وَهُوَ مَسْئُولٌ " عَنْ رَعِيَّتِهِ، قَالَ فَسَمِعْتُ هَؤُلَاءِ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ وَأَحْسِبُ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ وَالرَّجُلُ فِي مَالِ أَبِيهِ رَاعٍ، وَهُوَ مَسْئُولٌ " عَنْ رَعِيَّتِهِ، فَكُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ " عَنْ رَعِيَّتِهِ

ترجمہ:۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ تم میں سے ہر ایک چرواہا بنایا گیا ہے اور ہر ایک اپنے گلے کے بارے میں مسئول ہے۔ امام راعی ہے اور وہ اپنے رعایا کے بارے میں مسئول ہوگا۔ اور ہر آدمی اپنے گھر والوں کا راعی ہے اور وہ اپنی رعیت کے بارے میں مسئول ہوگا۔ عورت اپنے خاوند کے گھر میں حکومت رکھتی ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ اور خادم اپنے آقا کے مال میں حکومت رکھتا ہے اور وہ بھی اس کے متعلق مسئول ہوگا۔ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ ان لوگوں کا ذکر تو میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا اور میرا گمان یہ ہے کہ نبی ﷺ نے بھی فرمایا کہ بیٹا اپنے باپ کے مال میں اختیار رکھتا ہے اور وہ اس کی ذمہ داری میں مسئول ہوگا۔ غرض تم میں سے ہر ایک حاکم ہے اور ہر ایک سے اس کی رعایا کے بارے میں بازپرس ہونا ہے۔

وضاحت:۔ راعی چرواہے کو کہتے ہیں اور رعیت اس کے گلے کو جس کو چرانے اور جس کی حفاظت کی ذمہ

داری اس پر ڈالی گئی ہو۔ اس حدیث میں راعی سے مراد ہر وہ شخص ہے جس کی سپردگی میں کوئی چیز دی جاتی ہے یا جس کو کوئی ذمہ داری سونپی جاتی ہے۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص بھی ذمہ دار بنایا جاتا ہے تو وہ اپنی ذمہ داری میں مسئول ہوگا۔ اس سے باز پرس کی جائے گی کہ اس نے اپنی ذمہ داری نبھائی یا نہیں۔

ایک حکمران پورے ملک کا سربراہ ہوتا ہے اور ملک کے تمام باشندے اس کے کنٹرول میں ہوتے ہیں لہٰذا حکمران کی ذمہ داری کا دائرہ سب سے وسیع ہوتا ہے۔ اس سے اس بات کی باز پرس ہوگی کہ اس نے عوام الناس کی بہبود اور ان کی مشکلات کو دور کرنے کے لیے کیا اقدامات کیے۔ ان کو انصاف ملا یا نہیں۔ ملکی وسائل پر کنٹرول کس کا رہا۔ عوام کو ان سے بہرہ مند ہونے کا موقع دیا گیا یا نہیں۔ حکمران کا طرز حکمرانی ظالمانہ تھا یا مشفقانہ۔ حکمران اور اس کی مملکت کی طرح ایک چھوٹی ریاست گھر کی ہوتی ہے جس میں شوہر گھر کا سربراہ ہوتا ہے اور بیوی بچے اس کی ذمہ داری میں دیے جاتے ہیں۔ یہاں شوہر سے باز پرس ہوگی کہ اس نے بیوی بچوں کے حقوق کیسے ادا کیے۔ ان کے مطالبات ہی پورے کرتا رہا یا کبھی نیکی اور حق کی بات بھی ان کے کانوں میں ڈالنے کی کوشش کی۔ اس نے ان کے لیے جو وسائل رزق فراہم کیے وہ جائز ذرائع سے حاصل کیے گئے یا ناجائز ذرائع سے۔ شوہر کی عدم موجودگی میں بیوی گھر کی مالکہ ہوتی ہے لہٰذا اس دائرہ میں اس سے بھی باز پرس ہوگی۔ علیٰ ہذا القیاس اگر نوکر یا خادم پر گھر والے اعتماد کرتے ہیں اور تصرف کے لیے مال اس کے حوالہ کرتے ہیں تو وہ بھی مسئول ہوگا کہ اس نے مالک کی مرضی کے مطابق کام کیا یا نہیں۔

حدیث میں اصول یہ بتایا ہے کہ تم میں سے ہر ایک ذمہ دار بنایا گیا ہے اور اس کی ذمہ داری کے باب میں اس سے حساب لیا جائے گا۔ لہٰذا جن افراد کے نام حدیث میں بیان ہوئے ہیں صرف وہی مراد نہیں لیے جائیں گے بلکہ اس دائرہ کو آپ جتنی وسعت دینا چاہیں دے سکتے ہیں۔ چنانچہ ایک کارخانے کا مالک اپنے کارکنوں کے بارے میں، ایک دفتر کا انچارج اپنی اور ماتحتوں کی ڈیوٹی کے بارے میں، ایک مزدور اپنی ذمہ داری کے بارے میں مسئول ہوگا۔

ابن عمرؓ حدیث کے پہلے حصہ کے متعلق بتاتے ہیں کہ میں نے اس کو رسول اللہ ﷺ سے سنا۔ باقی حصہ کے بارے میں فرمایا کہ میرا گمان ہے کہ نبی ﷺ نے یوں بھی فرمایا۔ انہوں نے یہ فرق اس لیے واضح کیا کہ رسول اللہ ﷺ سے سننے کا شرف الگ ہے، اگرچہ باقی باتیں بھی مسلمات میں سے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر والد اپنے بیٹے کو کوئی ذمہ داری سونپتا اور اپنا مال اس کے تصرف میں دیتا ہے تو بیٹا اس بنا پر غیر مسئول نہیں ہوسکتا کہ وہ والد کی صلبی اولاد ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی

درس موطا امام مالکؒ

(کتاب الجہاد)

باب : النهى عن قتل النساء والولدان فى الغزو

باب: جنگ میں عورتوں اور بچوں کے قتل کی ممانعت

۸۔ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَن ابن شهاب عن ابن لكعب بن مالك قال: حسبت انه قال عن عبدالرحمن بن كعب انه قال: نهى رسول الله ﷺ الذين قتلوا ابن ابى الحقيق عن قتل النساء والولدان. قال فكان رجل منهم يقول: برحت بنا امراة ابن ابى الحقيق بالصياح فارفع السيف عليها ثم اذكر نهى الرسول الله ﷺ فاكف ولو لا ذالك استرحنا منها.

ترجمہ:۔ کعب بن مالک کے ایک بیٹے سے، راوی کا گمان ہے کہ عبدالرحمٰن بن کعب ہیں، روایت ہے کہ انہوں نے کہا، رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں کو جنہوں نے ابن ابی الحقیق کو قتل کیا، عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے سے روکا۔ وہ کہتے ہیں کہ ان قاتلوں میں سے ایک آدمی کہتا تھا کہ ابن ابی الحقیق کی بیوی شور کرتی رہی کہ ہمارا راز واضح کردے۔ میں اس کے اوپر تلوار اٹھاتا تو یاد کرتا کہ نبی ﷺ نے منع کیا تھا تو رک جاتا۔ اگر آنحضرت ﷺ کی یہ ممانعت نہ ہوتی تو ہم اس سے جان چھڑا ہی لیتے۔

وضاحت:۔ بَرَحَتْ بِنَا کے معنی یہ ہیں کہ شور کیے جا رہی تھی۔ مقصد یہ کہ لوگوں کو اطلاع ہوجائے اور بچانے کے لیے آجائیں۔

ابن ابی الحقیق خیبر کا مشہور یہودی تھا جس نے بڑی سازشیں کی تھیں اور غطفان وغیرہ کا ایک لشکر کہ جو حملہ ہوا تھا اس میں اس کی سازش کو بڑا دخل تھا اس وجہ سے آنحضرت ﷺ نے اس کے قتل کا حکم دیا تھا۔ جن لوگوں کو قتل پر مقرر کیا تھا ان میں سے ایک آدمی نے روایت کی ہے کہ ہم جب پہنچے تو اس کی بیوی نے شور مچانا شروع کردیا اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہمارا راز کھولنے کے لیے ایسا کر رہی ہے۔ کہتے ہیں کہ

میں تلوار اٹھاتا تھا کہ قتل کر دوں لیکن پھر آنحضرت ﷺ کی ممانعت یاد آ جاتی تو میں رک جاتا۔

عورتوں اور بچوں کے قتل کی ممانعت تو فطرت کے عین مطابق ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ غیر مسافی یعنی تلوار نہ اٹھانے والی آبادی لڑنے کی پوزیشن میں نہیں ہوتی۔ لڑائی میں شریک نہ ہو تو ان پر ہاتھ نہ اٹھانے کا حکم آج کے بین الاقوامی قانون میں بھی ہے اور اسلام تو دین فطرت ہے لیکن اس زمانے میں مسئلہ بہت پیچیدہ ہو گیا ہے کہ اب عورتیں فوج میں بھرتی ہوتی ہیں اور ان کی ایک رجمنٹ بھی ہوتی ہے۔ اور یہود وغیرہ کی اسکیم ہے کہ بعض کاموں کے لیے بچوں کو بھی شامل کریں گے تو اس زمانے میں کیا صورت ہو گی۔ اس صورت میں ممانعت کا حکم تبدیل ہو گا اس لیے کہ اس کی جو علت ہے وہ غیر مسافی ہونا ہے۔ ایک موقع پر آنحضرت ﷺ نکلے تو دیکھا کہ ایک عورت مقتول ہے تو آپ نے فرمایا کیا یہ بھی جنگ کر رہی تھی؟ یعنی آپ نے اعتراض کیا۔ معلوم ہوا اصل علت غیر مسافی آبادی ہونا ہے۔ اب عورتیں اپنی پوزیشن بدل دیں گی اور ہر میدان میں مردوں کے دوش بدوش رہیں گی تو یہ احکام بھی بدل جائیں گے۔

یہ بات کہ آنحضرت ﷺ نے ابن ابی الحقیق کے قتل کے موقع پر ممانعت کی تھی یہ راوی کا قیاس معلوم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قاتلوں کے اندر کے ایک شخص نے یہ بات کہی تو ان کو گمان ہوا کہ اس موقعہ پر حکم دیا ہے لیکن یہ کوئی ضروری نہیں ہے۔

۹۔ وحدثنی عن مالک عن نافع عن ابن عمرؓ ان رسول الله ﷺ رای فی بعض مغازیه امراۃ مقتولة فانکر ذالک و نهی عن قتل النساء والصبیان.

ترجمہ:۔ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے کسی جنگ میں دیکھا کہ ایک عورت مقتول ہوئی ہے تو آپ نے اس کو بہت ناگوار محسوس کیا اور عورتوں اور بچوں کے قتل سے روک دیا۔

وضاحت:۔ اس روایت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ راوی کہتے ہیں کہ مقتولہ کو دیکھ کر ممانعت کا حکم دیا تھا۔ متعین طور پر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کس جنگ کے موقع پر حکم دیا تھا لیکن یہ معاملہ ایسا ہے کہ اگر آپ ﷺ نے حکم نہ بھی دیا ہو گا تو لوگوں کو معلوم رہا ہو گا اس لیے کہ اس وقت کا بھی ایک قانون جنگ کا تھا کہ عورتیں اور بچے قتل نہیں ہوتے تھے۔ اوپر والی روایت میں راوی کا جو بیان ہے اس میں ان کو شبہ ہوا ہے۔ یہ روایت زیادہ بہتر طریقہ پر معین کرتی ہے اور قرینہ بھی اس بات کا ہے کہ بالکل شروع میں منع کر دیا گیا تھا۔ یہ باتیں جنگ بدر میں بھی لوگوں کو معلوم رہی ہوں گی اور اس سے پہلے بھی معلوم رہی ہوں گی۔

۱۰۔ وحدثنی عن مالک عن یحییٰ بن سعید ان ابابکر الصدیق بعث جیوشاً الی الشام فخرج یمشی مع یزید بن ابی سفیان و کان امیر ربع بن تلک الارباع فزعموا

ان یزید قال لابی بکر اما ان ترکب و اما ان انزل، فقال ابوبکر ما انت بنازل، و ما انا براکب انی احتسب خطای هذه فی سبیل الله، ثم قال له انک ستجد قوماً انهم حبسوا انفسهم لله فذرهم و ما زعموا انهم حبسوا انفسهم له، و ستجد قوماً فحصوا عن اوساط رؤوسهم من الشعر فاضرب ما فحصوا عنه بالسیف، و انی موصیک بعشر لا تقتلن امراۃ ولا صبیاً، ولا کبیراً هرما ولا تقطعن شجراً مثمراً، و لا تخربن عامراً، ولا تعقرن شاۃ، ولا بعیراً، الا لما کلة ولا تحرقن نخلاً، ولا تغرقنه، ولا تغلل، ولا تجبن.

ترجمہ:۔ یحییٰ بن سعید راوی ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کچھ دستے شام کی طرف بھیجے تو خود بھی یزید بن ابی سفیان کے ساتھ جو ایک چوتھائی فوج کے کمانڈر تھے، نکلے۔ تو یزید نے ابوبکرؓ سے کہا کہ یا تو جناب سوار ہو جائیں یا پھر میں اتر جاتا ہوں۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا نہ تمہیں اترنا ہے اور نہ میں سوار ہوں گا۔ میں اپنے ان قدموں کو اللہ کی راہ میں شمار کروں گا۔ پھر انہوں نے ان سے (یزید سے) کہا تم ایسے لوگوں سے ملو گے کہ جن کا گمان یہ ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو اللہ کے راستہ میں روک رکھا ہے۔ تو ان کو ان کے گمان کے اوپر چھوڑ دو (تعرض نہ کرو) اور تم ایسے لوگوں کو بھی پاؤ گے کہ جنھوں نے اپنے سروں کے بیچ کے بال منڈوائے ہوں گے تو مارو ان کے سروں پر تلوار۔ اور میں تم کو ان باتوں کی ہدایت کرتا ہوں۔ کسی عورت کو قتل نہ کرو، نہ کسی بچے کو نہ کسی بڑے بوڑھے کو، اور نہ کسی پھل دار درخت کو کاٹنا اور نہ کسی آباد چیز کو اجاڑنا، نہ کسی بکری کو زخمی کرنا اور نہ کسی اونٹ کو الا آنکہ کھانے کی ضرورت ہو۔ کھجور کے درخت کو مت جلانا اور نہ اس کو غرق کرنا اور خیانت نہ کرنا اور بزدلی نہ دکھانا۔

وضاحت:۔ روایت میں زعموا کا جو لفظ آیا ہے یہ خالص عربی کا ہے۔ زعم یہ ہے کہ یزید بن ابی سفیان نے حضرت ابوبکر سے کہا کہ یا تو جناب سوار ہو جائیں یا میں اتر جاتا ہوں اور حضرت ابوبکرؓ اپنے کمانڈر کے ساتھ ساتھ چلنے لگے اور کہا نہ تمہیں اترنا ہے نہ میں سوار ہوتا ہوں۔ میں اپنے ان قدموں کو اللہ کی راہ میں شمار کرتا ہوں یعنی پیدل ہی چلوں گا۔ یہ جو حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ تم ایسے لوگوں سے ملو گے جو اپنے سروں کے بیچ کے بال منڈاتے ہیں تو یہ عیسائیوں کا ایک فرقہ تھا اور یہ بڑے متعصب لوگ تھے۔ تو فرمایا ان کے سروں پر تلوار مارو یعنی راہبوں کو تو چھوڑ دینا جو اس زعم میں مبتلا ہیں کہ اللہ کی عبادت میں ہیں لیکن ان لوگوں کو مارنا۔ پھر آپ نے فرمایا کہ میں تم کو دس باتوں کی تاکید کرتا ہوں۔ اس وصیت میں عورتیں، بچے، بوڑھے اور مثمر درخت کاٹنے کی ممانعت ہے سوائے جنگی ضرورت کے جیسا کہ قرآن مجید میں سورہ حشر میں ذکر ہے۔ معلوم ہوا کہ ممانعت بالکل فطری ہے لیکن کسی بوڑھے کے متعلق معلوم ہوا کہ بڑا فسادی

ہے یا کسی عورت کے متعلق معلوم ہوا کہ جاسوس ہے یا اس زمانے میں عورتیں فوج میں مقابل ہیں تو یہ مستثنیٰ نہیں ہیں۔ آباد کھیتوں اور کسی چیز کو بھی اجاڑنے کی اجازت نہیں ہے۔ کسی بکری یا اونٹ یا کسی اور جانور کو نقصان نہیں پہنچا سکتے ہاں اپنی غذائی ضرورت کے لیے لے سکتے ہیں۔ اس میں بھی فقہا یہ قید لگاتے ہیں کہ ذخیرہ نہیں کر سکتے۔ اخلاقی طور پر یہ ہے کہ کوئی خیانت نہیں کی جائے گی۔ مال غنیمت جو ملے اس میں کوئی خیانت نہیں کی جائے گی۔ اور آخری بات یہ کہ بزدلی نہ دکھانا۔ اصل چیز یہ ہے کہ بہادر رہو۔

۱۱۔ وحدّثنی عن مالک انه بلغه انّ عمر بن عبدالعزیز کتب الی عامل من عماله انه بلغنا ان رسول الله ﷺ کان اذا بعث سریة یقول لهم اغزوا باسم الله فی سبیل الله تقاتلون من کفر بالله لا تغلوا و لا تغدروا و لا تمثلوا و لا تقتلوا ولیدا و قل ذالک لجیوشک و سرایاک ان شاء الله والسلام علیک.

ترجمہ:۔ امام مالک کہتے ہیں کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے گورنروں میں سے ایک گورنر کو لکھا کہ مجھے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب کسی سریہ پر کوئی دستہ بھیجتے تو ان کو ہدایت فرماتے کہ جنگ کیجیو اللہ کے نام سے اللہ کے راستہ میں، جنگ کیجیو ان سے جو کفر باللہ کے مرتکب ہیں اور خیانت نہ کیجئے۔ اور دغابازی نہ کیجئے، مثلہ نہ کرو، بچہ کو قتل نہ کرو، اور یہی ہدایت تم اپنے تمام فوجوں اور دستوں کو کردو ان شاء اللہ وسلام علیک۔

وضاحت:۔ امام مالک نے بات کئی جگہ عمر بن عبدالعزیز تک پہنچائی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عمر بن عبدالعزیز خلیفہ راشد ہیں۔ حالانکہ خلافت راشدہ میں اور ان میں بعد ہے لیکن اس کے باوجود کیونکہ خلیفہ راشد کی سنت، سنت نبیؐ ہے۔ علیکم بسنتی وسنت خلفائے راشدین، شریعت کے قانون کی حیثیت سے ان کی بات کا ذکر کیا ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے ایک گورنر کو لکھا کہ آنحضرت ﷺ کا یہ طریقہ رہا ہے کہ فرماتے میں تمہیں یہ ہدایت دیتا ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی قانون وہی ہے جو فطرت پر مبنی ہے اور پہلے سے معلوم تھا۔

تقاتلون من کفر باللہ، یہ خبر کے اسلوب میں امر ہے۔ جس امر کو عظمت، ارشاد اور شفقت کے ساتھ سمجھاتا ہو اس کو امر کے صیغہ کے بجائے خبر کے اسلوب میں بیان کرتے ہیں۔ اردو میں بھی یہ اسلوب ہے مثلاً، یہاں سے وہاں جائیے گا وہاں سے داہنے مڑ جائیے گا پھر گلی میں سیدھے چلے جائیے وغیرہ۔ یہ سب خبریہ جملہ ہیں۔ باقی ہدایات واضح ہیں۔

باب: ما جاء فی الوفاء بالامان

باب: کسی کو امان دینے کا وعدہ کرلیا تو اس بارے کیا حکم ہے

۱۲۔ حدثنی یحیی عن مالک عن رجل من اهل الکوفه ان عمر بن الخطاب کتب الی عامل جیش کان بعثه انه بلغنی ان رجالا منکم یطلبون العلج حتی اذا اسند فی الجبل وامتنع. قال رجل مطرس یقول الا تخف فاذا ادرکه قتله و انی والذی نفسی بیده لا اعلم مکان واحد فعل ذالک الا ضربت عنقه. قال یحیی سمعت مالکا یقول لیس هذا الحدیث بالمجتمع علیه و لیس علیه العمل.

ترجمہ:۔ امام مالک کوفہ کے ایک شخص سے روایت کر رہے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب نے ایک کمانڈر کو جس کو انہوں نے کوفہ کے علاقہ میں بھیجا تھا یہ ہدایت کی کہ مجھے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ تم میں سے کچھ لوگ کسی کافر کا تعاقب کرتے ہیں تو جب وہ پہاڑوں میں جا چھپتا ہے اور محفوظ ہو جاتا ہے تو ایک شخص یہ کہتا ہے کہ 'مطرس' ڈرو نہیں، تو جب وہ اتر آتا ہے، وہ اس کو پالیتا ہے تو اس کو قتل کر دیتا ہے۔ تو میں تمہیں اس ذات کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جس کی مٹھی میں میری جان ہے کہ میں کسی ایسے شخص کا ہونا نہیں جانوں گا جس نے یہ کہا ہے مگر اس کے گردن اڑادوں گا۔ یحییٰ کہتے ہیں کہ انہوں نے امام مالک کو یہ کہتے سنا کہ یہ حدیث مجتمع علیہ نہیں ہے اور اس پر عمل نہیں ہے۔

وضاحت:۔ امام مالک روایت کر رہے ہیں 'رجل من اهل الکوفه' نام نہیں لیتے۔ اگر امام مالک نہ ہوتے تو یہ تدلیس ہوتی، کسی دوسرے کی روایت قبول نہیں ہو سکتی، لیکن امام مالک کے بارے میں کون بول سکتا ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اس سے مراد سفیان ثوری بھی ہو سکتے ہیں اس لیے کہ بعض روایات ان سے آئی ہیں۔

روایت سے حضرت عمرؓ کا مذہب تو معلوم ہو گیا لیکن امام مالک کا تبصرہ یہ ہے کہ یہ روایت مجتمع علیہ نہیں ہے اور اس پر عمل نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ روایت میں اختلاف نہیں ہے، اس پر عمل میں اختلاف ہے۔ اس کی توجیہ لوگ یہ کرتے ہیں کہ امیر المومنین نے یہ بات دھمکی کے طور پر کہی تھی تاکہ لوگ ایسی حرکت نہ کریں لیکن واقعہ یہ ہے کہ والذی نفسی بیدہ، قسم کے ساتھ کہتے ہیں، اللہ کی قسم جس کی مٹھی میں میری جان ہے تو ایسی بات حضرت عمرؓ محض دھمکی کے لیے نہیں کہہ سکتے۔ حضرت عمرؓ خلیفہ راشد ہیں اور خلیفہ راشد

کو یہ بات تو معلوم ہے کہ اس کا ہر عمل تقلید کے لیے ہے، لوگ تقلید کریں گے اس لیے کہ **علیکم بسنتی و سنت خلفائے الراشدین** تو حضرت عمرؓ اتنا بڑا سنگین مذاق تو نہیں کر سکتے کہ محض لوگوں کو ڈرانے کے لیے وہ اس طرح کی بات کریں۔ اول تو وہ بغیر قسم کھائے بھی یہ نہیں کہہ سکتے لیکن یہاں قسم کے ساتھ ہے۔ اس لیے میری رائے میں ان لوگوں کی تاویل غلط ہے۔

اس روایت کو یہ لوگ کیوں نہیں مانتے؟ اس کی وجہ وہ روایت ہے کہ **لا یقتل المومن بالکافر** (کوئی مومن کسی کافر کے بدلہ میں قتل نہیں ہوگا) اس روایت کی بنا پر یہ کہتے ہیں۔ اس کی وجہ سے اس زمانے میں تو بڑی مشکلیں پیدا ہوں گی اس لیے کہ اب اقلیتوں کے بارے میں بین الاقوامی قانون ہے۔ نیز یہ ہے کہ اس زمانے میں جو غیر مسلم رعایا کسی حکومت کو ملتی ہے اس کی نوعیت از روئے شریعت معاہد اہل ذمہ کی ہوگی یعنی معین شرائط کے اوپر وہ آپ کی امان میں آتے ہیں۔ مفتوح اہل ذمہ کا تو سوال ہی نہیں ہے اور نہ ہی اسمٰعیل کا سوال ختم ہو چکا ہے۔ بین الاقوامی قانون کے تحت آپ اقلیتوں کے ساتھ معاملہ کریں گے اس کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔ اگر آپ قانون یہ بنائیں کہ آپ کے ملک میں اگر کوئی مسلمان کسی عیسائی یا ہندو کو قتل کر دے گا تو اس کے بدلے میں وہ قتل نہیں ہوگا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تمام عیسائی ملکوں میں اور ہندوؤں میں یہی ہوگا کہ مسلمانوں کے متعلق ہمارا قانون بھی یہی ہے کہ مسلمان کے بدلے کوئی عیسائی یا ہندو قتل نہیں ہوگا۔ یہ بات بین الاقوامی قانون کے بھی خلاف ہے۔ آپ یہ کریں تو بین الاقوامی طور پر بھی غل مچے گا کہ نہایت ہی پست نظام کی حکومت ہے جہاں اقلیتوں کی جان و مال محفوظ نہیں ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ **لا یقتل المومن بالکافر** کا محل کیا ہے؟ ظاہر ہے اس کا کوئی محل ہوگا تو محل تو ایسے نکل سکتے ہیں جس میں یہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً عراق وغیرہ میں عباسیوں کے دور میں جو معاہد اہل ذمہ آگئے، جنہوں نے یہ کہا کہ ہم آپ سے جنگ نہیں کرنا چاہتے، آپ کی رعایا بن کر رہنا چاہتے ہیں تو ان کے متعلق یہ قانون ہے جن شرائط پر اسلامی حکومت نے ان کو امان دی، ان شرائط کو لازماً پورا کریں۔ ان کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مفتوح اہل ذمہ نہیں ہیں۔ مفتوح اہل ذمہ ان کو کہتے ہیں جنہوں نے آپ سے جنگ کی اور آپ نے ان کو شکست دے کر مغلوب کیا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان پر بھی اب بین الاقوامی قانون بن گیا ہے اور وہ عدل کے مطابق ہے۔ میرے نزدیک حضرت عمرؓ کا فتویٰ بالکل ٹھیک ہے اور اس کی خلاف ورزی نہیں ہو سکتی اور ان لوگوں کی جو توجیہ ہے وہ بالکل بے جان ہے۔

اب یہ ہے کہ وہ روایت (**لا یقتل المومن بالکافر**) دیکھنی پڑے گی۔ مجھے فرصت نہیں ملی

کہ دیکھتا کہ ابن عبدالبر نے اس پر بحث کی ہے یا نہیں کی ہے۔ یہ مسئلہ بہت پیچیدہ سا ہے۔ اگر بات صحیح ہے تو یہ مانا جائے گا اس زمانے میں حکم کا مفہوم یہ ہوگا کہ مفتوح اہل ذمہ میں سے کسی کو کوئی مسلمان قتل کر دے تو بدلے میں وہ قتل نہیں ہوگا اس لیے کہ مفتوح اہل ذمہ کے متعلق یہ پابند نہ تھے مگر معاہد کے متعلق اس کا امکان نہیں اس لیے کہ وہ اس کے تحت آ جاتا ہے جس کو آپ نے کہہ دیا 'مطرس' تب اس کی توجیہ ہو جائے گی لیکن اس زمانے میں یہ چیز کام نہیں دے سکتی اس لیے کہ اب بین الاقوامی قانون الگ بن گیا ہے۔

۱۳۔ **وسئل مالک عن الاشارة بالامان أهی بمنزلة الکلام؟ فقال نعم و انی اری ان یتقدم الی الجیوش ان لا تقتلوا احدًا اشاروا الیه بالامان لان الاشارة عندی بمنزلة الکلام، و انه بلغنی ان عبدالله بن عباسؓ قال: ما ختر قوم بالعهد الا سلط الله علیهم العدو.**

ترجمہ:۔ امام مالکؒ سے فتویٰ پوچھا گیا اس اشارہ کے بارے میں جو امان کے لیے ہو۔ کیا یہ کلام کی جگہ ہوگا؟ تو انہوں نے کہا ہاں یہ بمنزلہ کلام ہے اور میری رائے یہ ہے کہ فوجوں کو یہ احکام دے دیے جائیں کہ ان میں سے کسی کو قتل نہ کرو جن کی طرف تم نے امان کا اشارہ کیا ہو کیوں کہ اشارہ میرے نزدیک بمنزلہ کلام ہے۔ کہتے ہیں کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ عبداللہ بن عباسؓ نے کہا کہ جس قوم نے بھی بے وفائی کی تو اللہ تعالیٰ نے اس کے اوپر دشمن کو مسلط کر دیا۔

وضاحت:۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ "فوجوں کو احکام دے دیئے جائیں کہ ان میں کسی کو قتل نہ کرو جن کی طرف پہلے سے تم نے امان کا اشارہ دے دیا ہے کیوں کہ میرے نزدیک اشارہ بمنزلہ کلام ہے"۔ اور جب آپ مانتے ہیں اشارہ بمنزلہ کلام ہے تو پھر یہ ماننا چاہیے کہ اگر اس نے امان دے کر قتل کر دیا تو بڑی بزدلی ہے اور عام انسانیت کے تقاضا کے منافی بھی ہے۔ اس میں یہ بات بھی ہے کہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یا تو انتقام کا جذبہ ہے یا یہ کہ جو جس کو قتل کرے تو اس کا سامان اس کو ملتا تھا اس لیے اس طمع میں قتل کیا ہو تو اس میں سے کوئی جذبہ بھی شریفانہ نہیں ہے۔

امام مالک یہ بھی کہتے ہیں کہ عبداللہ بن عباسؓ نے کہا کہ جس قوم نے بھی بے وفائی کی تو اللہ تعالیٰ نے دشمن کو اس کے اوپر مسلط کر دیا۔ بے وفائی کی سزا یہی ہے تو سوال یہ ہے کہ جب یہ سب کچھ آپ مانتے ہیں کہ اشارہ کلام ہے، میں کہتا ہوں کہ کلام سے بھی زیادہ زور ہے۔ کتنے اشارے ہیں کہ جو کلام سے بھی زیادہ بلیغ ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کی بات بالکل ٹھیک ہے۔

باب: العمل فيمن اعطى شيئاً فى سبيل الله

۱۴۔ حدثنی یحییٰ عن مالک عن نافع عن عبدالله بن عمرؓ انه کان اذا اعطی شیئاً فی سبیل الله یقول لصاحبه اذا بلغت وادی القری فشأنک به. و حدثنی عن مالک عن یحییٰ بن سعید ان سعید بن المسیب کان یقول: اذا اعطی الرجل الشیئ فی الغزو فیبلغ به راس مغزاته فهو له.

ترجمہ:۔ نافع روایت کرتے ہیں کہ عبداللہ بن عمرؓ کسی کو کوئی چیز فی سبیل اللہ دیتے تو جس کو دیتے اس کو کہہ دیتے کہ جب آپ وادی قریٰ پہنچ جائیں تو پھر آپ کو اختیار ہے۔

سعید بن مسیب کا فتویٰ یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی کو جہاد کے مقصد کے لیے کچھ دے تو جب وہ راس مغزاتہ پہنچ جائے تو وہ چیز اس کی ہوگئی۔

وضاحت:۔ فی سبیل اللہ دینے سے مراد یہاں جہاد کے لیے دینا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کسی کو کچھ دیتے تو کہہ دیتے کہ جب آپ وادی قریٰ پہنچ جائیں تو پھر آپ کو اختیار ہے۔ وادی قریٰ شام کی سرحد پر ہے۔ وہاں سے دشمن کا علاقہ شروع ہوتا تھا تو ان کا مطلب یہ رہا ہوگا کہ اب آگے جائے گا تو جہاد ہی میں جائے گا اس لیے اس کو اختیار دے دیا لیکن میرے نزدیک یہ محض تکلف ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ آدمی فی سبیل اللہ دے چکا تو اس کا ثواب لکھا گیا وہ جہاد میں جائے یا نہ جائے آپ کے ثواب میں کمی نہیں۔ یہ محض عبداللہ بن عمر کا تشخص ہے۔ میرے نزدیک یہ ہے کہ نیکی کر دریا میں ڈال مگر آپ کے دینے میں اخلاص ہے تو ازروئے قرآن آپ کا اجر عنداللہ محفوظ ہے۔

سعید بن مسیب کے فتویٰ کے بارے میں بھی میری رائے یہی ہے کہ جب آپ نے دے دیا تو آپ کی نیکی میں کوئی کمی نہیں۔ راس مغزاتہ وہ جگہ ہے جہاں سے شام کی سرحد شروع ہوتی تھی۔ سعید بن مسیب مدینہ کے بڑے فقیہ ہیں، لیکن انہوں نے بھی مشروط کر دیا ہے حالانکہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔

۱۵۔ وسئل مالک عن رجل أوجب علی نفسه الغزو فتهجز حتی اذا اراد ان یخرج منعه ابواه، او احدهما، فقال لا یکابرهما ولکن یوخر ذالک الی عام آخر فاما الجهاز فانی اری ان یرفعه حتی یخرج به، فان خشی ان یفسد باعه و امسک ثمنه حتی یشتری به ما یصلحه للغزو فان کان موسراً یجد مثل جهازه اذا خرج فلیصنع بجهازه ماشاء.

ترجمہ:۔ امام مالک سے اس شخص کے بارے میں فتویٰ پوچھا گیا جس نے اپنے اوپر جہاد واجب کر لیا اور اس کا سامان کر لیا یہاں تک کہ جب نکلنے کا وقت آیا تو ماں باپ یا ان میں سے کوئی ایک اس کو روک دے۔ تو انہوں نے کہا اس کے لیے جائز نہیں کہ ان سے جھگڑا کرے اور ان کی نافرمانی کرے بلکہ اپنا سب کچھ دوسرے سال کے ارادہ کے ساتھ اٹھا رکھے۔ اور اگر ڈر ہو کہ خراب ہو جائے گا تو اس کو بیچ دے اور اس کی قیمت روک لے یہاں تک کہ وہ اس کے ذریعہ جنگ کا ضروری سامان خریدے اور اگر مالدار آدمی ہے سمجھتا ہے کہ میرے پاس اتنے پیسے ہیں کہ میں پھر خرید لوں گا تو جو چاہے کرے۔

وضاحت:۔ یہ جتنے مسائل ہیں ان کی حیثیت اب علمی ہے اور زندگی سے ان کا تعلق نہیں رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ صورت تو اس وقت تھی جب کہ ہر شخص سپاہی تھا، مجاہد تھا اور اپنے سامان، سواری اور زادِ راہ کے ساتھ جہاد میں شریک ہوتا تھا۔ اب تو Standing Army کا دور ہے۔ اب فوج جس سامان سے لڑتی ہے وہ آپ کے پاس ہے نہ آپ رکھ سکتے ہیں اور نہ فوج آپ کی محتاج ہے۔ اب ان مسائل کی نوعیت علمی ہے کہ آپ کو اس دور کی تاریخ معلوم ہوگی کہ مسلمانوں میں اس زمانے میں جنگ کا قانون کیا تھا تاکہ آپ ان اخلاقی قوانین کو ملحوظ رکھیں۔ باقی رہ گیا کہ آج آپ سپاہی کو کیا دیں گے تو اس کی ضرورت اب اس کو نہیں ہے۔ نیز یہ ہے کہ اب غنیمت کا مسئلہ بالکل ختم ہو گیا ہے۔ پہلے تو یہ تھا کہ حکومت کو پانچواں حصہ ملتا تھا اور باقی تقسیم ہو جاتا تھا اب یہ سب چیزیں ختم ہو گئیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اب ان کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ سردی اور گرمی کا بہتر سے بہتر انتظام ہے۔ فوج کو وردی ملتی ہے، لڑائی کا سامان ملتا ہے، باضابطہ تنخواہ وہ پاتے ہیں غرض ہر چیز میسر ہے۔ حد یہ ہے کہ ملک کے بجٹ کا بڑا حصہ تو فوج ہی پر خرچ ہوتا ہے۔ اب Standing Army کے سوا کوئی امکان نہیں کہ جنگ لڑی جا سکے۔ اس زمانہ میں یہ تھا کہ جو جس کو قتل کرے اس کا سلب اس کو ملتا تھا اب یہ سوال بھی نہیں رہا۔ اب یہ ساری چیزیں تبدیل ہو جائیں گی البتہ آپ کی تاریخ آپ کو معلوم ہونی چاہیے۔

اس روایت میں امام مالک کہتے ہیں کہ والدین یا ان میں کوئی جہاد پر جانے سے روک دے تو ان سے جھگڑا نہ کرے اور آئندہ سال تک رک جائے۔ اب اس زمانے میں اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اول تو سپاہی کو حکم کسی سے پوچھ کر نہیں دیا جاتا اور وہ حکم نہ مانے تو کورٹ مارشل ہو جائے گا۔ ماں باپ ہی نہیں ساری دنیا سر پیٹے لیکن جس وقت آرڈر ملے تعمیل کرنی پڑے گی۔ تو یہاں جو رائے دی ہے اس

زمانے میں اس کی کوئی افادیت نہیں ہے۔ اب حالات بدل چکے ہیں۔ اب ہر سپاہی معاہدہ کے تحت فوج میں بھرتی ہوتا ہے اور اس کی پابندی لازمی ہے۔

باب: جامع النفل فی الغزو

باب: جہاد میں مال غنیمت کے بارے میں جامع روایات

۱۶۔ حدثنی یحیی عن مالک عن نافع عن عبداللہ بن عمرؓ ان رسول اللہ ﷺ بعث سریۃ فیھا عبداللہ بن عمرؓ قبل نجد فغنموا ابلاً کثیرۃ فکان سھما نھم اثنی عشر بعیراً او احد عشر بعیراً و نفلوا بعیراً بعیراً۔

ترجمہ:۔ عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک سریہ میں ایک دستہ نجد کی طرف بھیجا جس میں عبداللہ بن عمرؓ بھی شریک تھے اس میں بہت سے اونٹ غنیمت میں ملے تو دستے کے لوگوں کا جو حصہ بنا وہ بارہ بارہ بنا، یا گیارہ گیارہ اور اس کے علاوہ ایک ایک اونٹ بطور انعام دیا گیا۔

وضاحت:۔ روایت میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ راوی نے دونوں کو ملا کر بارہ بارہ کہہ دیا، بعض نے کہا گیارہ گیارہ اونٹ ملے تھے اور ایک ایک اونٹ بطور انعام دیا گیا۔ انعام دیا جا سکتا ہے، اور یہ تو آج بھی ہے، لیکن غنیمت کا سسٹم آج نہیں ہے۔ اج تو جو کچھ بھی نے میں آئے گا سب سرکار کا ہے فوج کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نہ اپنی سواری ہے نہ اپنا سامان، ہر چیز حکومت کی طرف سے ملی ہے یہاں تک کہ گھر اور تنخواہ بھی۔

اب یہ دیکھ لیجئے کہ گھوڑے کے متعلق جو فضائل آئے ہیں کہ تمام خیر اس کی پیشانی میں بندھا ہوا ہے، پیچھے روایت گزری ہے، اور اب اس زمانے میں گھوڑے کی جنگ کے نقطہ نظر سے کوئی حیثیت نہیں ہے، اگر ہے بھی تو بہت ہی معمولی، نہ ہونے کے برابر۔ اس زمانے میں یہ جنگ کا بڑا ہتھیار تھا۔ اس لیے اس کی حیثیت تھی ورنہ یہ گھوڑے کے فضائل نص سے نہیں ہے بلکہ اس ضرورت کی وجہ سے اس زمانے میں تھی۔ اس زمانے میں گھوڑا صدقہ سے بھی بری کر دیا گیا تھا یعنی زکوٰۃ اس میں نہیں تھی لیکن اب اس کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ اب جیپیں ہیں، ٹینک ہیں، طیارے اور میزائل ہیں۔ اب ان کی پیشانیوں پر سب کچھ بندھا ہوا ہے، لیکن یہ آپ کی تاریخ ہے، آپ کو جاننا چاہیے۔ آپ کے جو قوانین جنگ رہے ہیں سب سے

زیادہ مہذب اور ترقی یافتہ رہے ہیں۔ اس سے یہ اصول معلوم ہوتا ہے کہ مصلحت پر جو امور مبنی ہوں گے یا جو معروف کے تحت ہوں گے وہ زمانے کے حالات کے تحت تبدیل ہو جائیں گے البتہ شریعت کے جو احکام ہیں ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ صرف مجبوری کی حالت میں آپ کو رخصت ملے گی یعنی اضطرار میں حرام چیز آپ غیر باغ ولا عاد کی قید کے ساتھ ہی استعمال کر سکتے ہیں، اس سے زیادہ کی اجازت نہیں ہے۔ اب آپ نے بنک قائم کر لیے ہیں، ریلوے کا نظام ہے۔ Standing Army آپ کی ہو گئی ہے، شہروں کا نظام ہو گیا ہے، میونسپل کمیٹی اور کارپوریشن بن گئے ہیں اور اسمبلیاں اور پارلیمنٹ قائم ہو گئی ہیں تو یہ سب چیزیں زمانے کے لحاظ سے ہیں۔ اس میں آپ مجبور ہیں اور پابندی کرنی پڑے گی۔

۱۷۔ و حدثنی عن مالک عن یحیی بن سعید انہ سمع سعید بن المسیب یقول: کان الناس فی الغزو اذا اقتسموا غنائمھم یعدلون البعیر بعشر شیاہ. قال یقول فی الاجیر فی الغزو انہ ان کان شھد القتال، و کان مع الناس عند القتال، و کان حراً فلہ سھمہ و ان لم یفعل ذالک فلاسھم لہ. قال و سمعت مالک یقول: و اری أن لا یقسم الا لمن شھد القتال من الاحرار.

ترجمہ:۔ یحییٰ بن سعید کہتے ہیں کہ انہوں نے سعید بن مسیب سے سنا کہ وہ فرماتے تھے کہ لوگ جنگ میں جب غنیمت کا مال تقسیم کرتے تھے تو ایک اونٹ کو دس بکریوں کے برابر کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر مزدور جنگ میں اپنے آقا کے ساتھ جنگ میں شریک ہوگا اور آزاد بھی ہوگا تب اس کو حصہ ملے گا اور اگر وہ جنگ میں شریک نہیں ہوا تب اس کا حصہ نہیں ہوگا۔ مالک کہتے ہیں کہ میری رائے یہ ہے کہ جنگ کا مال غنیمت نہ تقسیم کیا جائے مگر احرار میں۔

وضاحت:۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر جنگ میں غلام بھی شریک ہوتا ہے تو اس کو بھی حصہ ملنا چاہیے، یہ ہو سکتا ہے کہ اس کا حصہ اس کے مالک کو دے سکتے ہیں لیکن نہ ملنے کی تو کوئی وجہ نہیں ہے۔ یہ ابواب اب سب ختم ہیں۔ اب کسی غیر متعلق آدمی یا کوئی مزدور وغیرہ جنگ کے قریب پھٹک نہیں سکتا، صرف وہی جا سکتا ہے جو فوج میں شامل ہے یا جس کو فوج لے جائے۔ ایک بات واضح ہے کہ مسلمانوں کا قانون جنگ اپنے زمانہ میں عدل پر مبنی اور ترقی یافتہ تھا۔

باب: مالا یجب فیه الخمس

باب: اس مال کا مسئلہ جس میں خمس نہیں نکالا جائے گا

۱۸۔ قال مالک فیمن وجد من العدو علی ساحل البحر بارض المسلمین فزعموا انهم تجار و ان البحر لفظهم، ولا یعرف المسلمون تصدیق ذالک، ولا أن مراکبهم تکسرت او عطشوا فنزلوا بغیر اذن المسلمین اری ان ذالک للامام یری فیهم رایه، و لا اری لمن أخذهم فیهم خمساً.

ترجمہ:۔ امام مالک کا فتویٰ یہ ہے کہ اگر دشمن کا کوئی مال مسلمانوں کے علاقہ میں ساحل بحر پر ملے اور انہوں نے یہ خیال کیا کہ تاجر لوگ تھے اور سمندر نے ان کو پھینک دیا اور مسلمانوں کو اس امر کی تصدیق نہیں ہے کہ ان کی کشتیاں ٹوٹ گئیں یا بہتے ہوئے یہاں وہ اتر پڑے۔ تو یہ معاملہ امام کے اختیار میں ہے کہ اس بارے میں فیصلہ کرے اور میں نہیں سمجھتا کوئی اس میں خمس لے گا۔

وضاحت:۔ یہ امام مالک کا فتویٰ ہے۔ مسلمانوں کے ساحلی علاقہ میں دشمن کا کچھ مال ملا ہے جس کی نوعیت واضح نہیں ہو رہی ہے۔ نوعیت واضح ہونا اس لیے ضروری ہے کہ مال کا حکم معین ہو سکے۔ اب اس کی نوعیت معلوم نہیں ہو رہی لیکن مال ملا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ معاملہ امام کے اختیار میں ہے۔ یہ لوگ امام کا لفظ اسٹیٹ کی جگہ پر بولتے ہیں اور امام کا لفظ بہت ہی مہذب تھا۔ کہتے ہیں کہ فے قرار دے کر اسٹیٹ کو دے دیا جائے۔ یہ نہیں ہوگا کہ حکومت کا خمس ہو اور بقیہ آپ کو دے دیا جائے۔ یہ امام مالک کا فتویٰ ہے اور ٹھیک ہے۔

یہ بات بھی ہے کہ خمس اسلام نے کیا ہے اس سے قبل چوتھا حصہ لیتے تھے اور باقی تقسیم کیا جاتا تھا۔ لیکن اسلام نے یہ کہا کہ غنیمت میں ⅕ حکومت کا ہوگا باقی تقسیم کر دیا جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ خمس کا نظام اسلام ہی نے پہلی مرتبہ نافذ کیا ہے۔ میں تاریخ کا طالب علم نہیں ہوں، میری رائے پر زیادہ اعتماد نہ کیجئے گا لیکن مطالعہ میں نظر آیا تو معلوم ہوا پہلے چوتھا تھا، اسلام نے پانچواں کیا ہے اور کہتے ہیں کہ جن کو ملا ہے ان کے لیے خمس نہیں ہے، یہ مالکیہ کا فتویٰ ہے، حدیث نہیں ہے۔

(ترتیب: سید اسحاق علی)

پروفیسر عبدالخالق فاروقی

قرآن کا فلسفہ تاریخ

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی آخری کتاب ہے اور یہ اصلاً کتاب ہدایت ہے۔ یہ نہ فلسفے کی کتاب ہے نہ تاریخ کی، لیکن اس میں فلسفہ بھی ہے اور تاریخ بھی۔ ٹھیک جس طرح دیگر علوم وفنون کے آخری مسائل کے متعلق بنیادی ہدایات کتاب اللہ کی آیات میں موجود ہیں اسی طرح تاریخ اور اس کے فلسفے کے متعلق بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن نے تاریخ کا جو نتیجہ خیز استعمال اپنے آفاقی پیغام کی ترسیل کے لیے کیا ہے وہی اس کا فلسفہ ہے۔ قرآنی فلسفہ فی الواقع تاریخ کے مقاصد کا تعین اور اس کے اثرات کی تصریح کرتا ہے۔

تاریخ معروف معنوں میں ایک قسم کی وقائع نگاری اور روداد نویسی ہے۔ انسان کی لکھی ہوئی تاریخ میں عام طور پر واقعات میں رنگ آمیزی اور مبالغہ آمیزی کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ اس میں بہت کچھ عمل دخل مورخ کے تعصبات، قومی مفاخر و مفادات، نسل پرستی اور زمانہ کے رسم و رواج کا ہوتا ہے۔ واقعات کے اخلاقی اسباب ونتائج کا سراغ لگانے کی کوشش شاذ و نادر کی جاتی ہے اور حالات کے بصیرت افروز تجزیے سے گریز کیا جاتا ہے جبکہ یہ تجزیہ ہی دراصل فلسفۂ تاریخ ہے۔

قرآن کا فلسفۂ تاریخ دراصل اسلام کے اخلاقی تصورِ زمان پر مبنی ہے جس کی نہایت مختصر، جامع، پراثر اور فکر انگیز تعبیر سورۃ العصر کی آیات میں پائی جاتی ہے۔ فرمایا:

وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝

﴿زمانہ شاہد ہے کہ انسان گھاٹے میں ہے بجز ان کے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی۔﴾

'عصر' کے مفہوم میں گزرا ہوا زمانہ بھی پایا جاتا ہے اور برق رفتاری سے گزرتا ہوا زمانہ بھی۔ زمانے کی قسم کھانے کا اصل مقصد یہ ہے کہ اس قسم سے ایک طرف تو اللہ تعالیٰ نے تاریخ کے ان واقعات کی

طرف توجہ دلائی ہے جو اس دنیا میں قانون مجازات کے تحت ظہور میں آئے اور جو قرآن اور دوسرے آسمانی صحیفوں میں بیان ہوئے ہیں، دوسری طرف لوگوں کو اس سے جھنجھوڑا ہے کہ لوگ اپنی زندگیاں غفلت میں نہ گزاریں بلکہ پوری مستعدی سے ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں۔ پچھلی قوموں پر اللہ تعالیٰ کے جو فیصلے نافذ ہوئے وہ ٹھیک ٹھیک ان کے اعمال کا بدلہ تھے۔ انہوں نے نیکیاں اور بھلائیاں کیں تو خدا نے ان کو عروج بخشا اور اگر انہوں نے ظلم وفساد کی راہ اختیار کی تو اپنے قانون کے مطابق اتمام حجت کے بقدر مہلت دینے کے بعد ان کو تباہ وبرباد کر دیا۔ اسی حقیقت کی یاد دہانی کے لیے یہاں زمانہ کی قسم کھائی کہ لوگ یاد رکھیں کہ ایک دن اسی قانونِ مکافات سے لازماً انہیں بھی دوچار ہونا ہے۔

اس خسارے سے نجات کا راستہ ہمیشہ سے یہی رہا ہے کہ ایمان، اعمال صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کا رویہ اختیار کیا جائے۔ یہ رویہ وہ ضمانت ہے جو انسان کو زمانے کی دست برد سے محفوظ رکھ سکتی ہے ورنہ وقت کی تیز رفتاری کسی سے وفا نہیں کرتی اور تاریخ کے دھارے ہر چیز کو اپنی لہروں میں بہا لے جاتے ہیں۔ قرآن مجید کے اس بنیادی فلسفۂ تاریخ کی روشنی میں جب ہم قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں تو پے در پے ہمارے سامنے ان اقوام ماضیہ کے عبرت ناک انجام آتے ہیں جن میں انبیاء علیہم السلام مبعوث کیے گئے۔ انہوں نے اپنی اپنی قوم کو دردمندی اور نہایت جانفشانی سے اللہ کا پیغام سنایا۔ ان کے اندر پائی جانے والی خرابیوں اور گمراہیوں پر معقول تنقید کر کے ان کی نامعقولیت ثابت کی اور پھر ان کی اصلاح کے لیے اپنی زندگیاں کھپا دیں، لیکن اس کے باوجود ان کی اکثریت انبیاء علیہم السلام پر ایمان نہ لائی بلکہ ان کے راستے میں مزاحم ہوئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت کے مطابق ان پر اتمام حجت کرنے کے بعد ان پر اپنے عذاب کا کوڑا برسایا اور انہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔ ان قوموں میں ہمیں زیادہ تر قوم نوح، قوم عاد وثمود، قوم ابراہیم، قوم لوط، قوم مدین اور قوم موسیٰ کے واقعات ملتے ہیں۔ یہ تمام قومیں اپنے اپنے دور میں نہایت شاندار تمدن رکھتی تھیں، ان کی سطوت وشوکت کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، دولت کی ریل پیل، عالی شان عمارات، محلات، باغات، بے شمار خزانے، کثرت ساز وسامان غرض سب کچھ انہیں ملا ہوا تھا لیکن پیغام الٰہی کی تکذیب کی پاداش میں سب ہلاک کر کے رکھ دی گئیں۔ پھر یہ واقعات محض داستان گوئی کی دلچسپی اور چٹخارے کے لیے بیان نہیں کیے گئے بلکہ صاحب قرآن آنحضرت ﷺ اور قرآن کے اولین مخاطب صحابہ رضوان اللہ علیہم سرزمین مکہ میں اسلامی دعوت کے ردعمل میں قریش کے ساتھ حق وباطل کی جس کشمکش سے دوچار ہو گئے تھے اور آزمائش وابتلاء کے جس فتنہ میں گرفتار تھے۔ انبیاءؑ کے ان واقعات اور ان کی قوموں کے ان سرگزشتوں میں ان کے لیے رہنمائی، تعلیم وتذکیر اور عبرت وبصیرت کا

گوناگوں پہلوؤں سے سامان موجود تھا۔ چنانچہ سورہ ھود میں تسلسل کے ساتھ ان اقوام ماضیہ کے حالات بیان کرنے کے بعد قرآن نے حضور ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا:

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَجَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (سورہ ھود: آیت ۱۲۰)

یعنی اوپر حضرت انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کی جو سرگزشتیں بیان ہوئی ہیں وہ ہم اس مقصد کے لیے سنا رہے ہیں کہ ان کے وہ پہلو تمہارے سامنے لائیں جو تمہارے دل کو مضبوط کریں تاکہ تم ان حالات کا پامردی اور استقلال کے ساتھ مقابلہ کر سکو جو تمہیں دین کی جدوجہد اور حق وباطل کی اس رزم گاہ میں پیش آرہے ہیں یا آئندہ آ سکتے ہیں اور اطمینان رکھو کہ ان واقعات سے حق کے غلبہ اور باطل کی شکست کی جو تاریخ تمہارے سامنے آئی ہے یہ تمام تر حقائق پر مبنی ہے۔ ایسا ہی ہوا ہے اور ایسا ہی ہوگا۔ یہ سنت الٰہی پر مبنی ہے اور سنت الٰہی میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی نیز ان سرگزشتوں اور واقعات میں ان لوگوں کے لیے بھی نصیحت اور یاد دہانی ہے جو تم پر ایمان لائے ہیں۔ مخالفتوں کے اس طوفان میں جن چیزوں سے انہیں بچنا ہے وہ بھی ان سے واضح ہوتی ہیں اور جو روش انہیں اختیار کرنی چاہیے وہ بھی سامنے آتی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ قرآن مجید میں واقعات سرگزشتوں کا اصل ہدف عبرت، سبق آموزی، تعلیم وتذکیر، رہنمائی اور نصیحت وموعظت ہے۔ جو روش قوموں کو عذاب الٰہی سے دوچار کرتی ہے اس سے انسان کو احتراز کرنا ہے اور جس طرز زندگی سے اللہ کی خوشنودی اور رضا حاصل ہوتی ہے اس پر انسان کو چلنا چاہیے اور یہی قرآن کا اصل فلسفۂ تاریخ ہے۔

اسی طرح نبی ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہؓ دعوت دین کے جن صبر آزما اور جان گسل مراحل سے گزر رہے تھے، ان کی تسلی اور حوصلہ افزائی کے لیے حضرت یوسف علیہ السلام کی داستان سنائی گئی جس کو قرآن نے 'احسن القصص' سے تعبیر کیا ہے۔ اگرچہ تمام انبیاءؑ اور ان کی قوموں کے جو حالات بیان کیے گئے سب ہی عبرت ورہنمائی، تعلیم وتذکیر اور سبق آموزی کے لیے بیان ہوئے ہیں، لیکن خاص طور پر حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں کے قصے میں گویا وہ آئینہ رکھ دیا گیا جس میں آنحضرت ﷺ کو پہلے سے وہ تمام حالات دکھا دیے گئے جو آپ کی قوم کے ہاتھوں آپ کو پیش آنے تھے۔ دارالندوہ میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قتل کے مشورے اور اس شر سے آپؐ کا محفوظ رہنا، غار ثور میں آپ کا چھپنا اور پھر مدینہ کو ہجرت فرمانا اور مدینہ پہنچ کر آپؐ کو اور آپ کے ساتھیوں کو بے مثال وقار واقتدار حاصل ہونا اور بالآخر مکہ کی فتح اور اہل مکہ کا اس کی اطاعت میں داخل ہونا اور اس موقع پر آنحضرت

ﷺ کا اپنی قوم کے لوگوں سے یہ سوال کہ بتاؤ میں تمہارے ساتھ کیا معاملہ کرنے والا ہوں وہ بولے کہ آپ کریم ابن کریم ہیں۔ جواب میں آپؐ نے فرمایا، میں تم سے وہی بات کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسف نے اپنے بھائیوں سے کہی تھی جاؤ تم آزاد ہو تم پر کوئی الزام نہیں۔ گویا پوری سرگزشت حضور ﷺ کے حالات سے مشابہ ہے۔

اسی طرح سرزمین مکہ میں اسلامی تحریک جس آزمائشی دور سے گزر رہی تھی اور قریش کے مظالم سے بعض اہل ایمان شکستہ دل ہو رہے تھے، انہیں اصحاب کہف کا قصہ سنایا گیا۔ یہ اپنے دور کے سچے اہل ایمان تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اصلی تعلیم کے علمبردار تھے، جب وہ دین کی خاطر رومیوں کے ہاتھوں ستائے گئے تو اصحاب کہف نے دعوت حق کی راہ میں بڑی استقامت دکھائی اور توحید اور آخرت کی دعوت پوری بے خوفی اور بے باکی سے دی یہاں تک کہ ان کا پورا ماحول ان کا دشمن بن کر اٹھ کھڑا ہوا اور انہیں سنگسار کرنے تک نوبت پہنچ گئی۔ ان حالات میں ان لوگوں نے ایک غار میں پناہ لی اور اس غار میں اللہ تعالیٰ نے ان کی حفاظت کے وہ سامان بہم پہنچائے جو صرف اللہ تعالیٰ ہی بہم پہنچا سکتا تھا۔ جس طرح اصحاب کہف اپنے ماحول میں ہدف مظالم بنے ہوئے تھے اسی طرح آنحضرت ﷺ اور آپؐ کے صحابہؓ بھی قریش کے مظالم کا ہدف تھے اور جس طرح اصحاب کہف کو غار میں پناہ لینی پڑی اسی طرح آپؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کے سامنے بھی ہجرت حبشہ، غار ثور اور ہجرت مدینہ کے مراحل آنے والے تھے اور ان مراحل میں اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت کی شانیں ظاہر ہونے والی تھیں۔

سورہ کہف کی آیات ۶۰ تا ۸۲ میں حضرت موسیٰ کے ایک تربیتی سفر کی سرگزشت بیان کی گئی ہے۔ وہ بحکم الٰہی خدا کے ایک بندہ خاص سے ملے جس کے ہاتھوں ایسے کاموں کا ظہور ہوا جو ظاہراً عقل و شریعت کے منافی تھے۔ حضرت موسیٰ معاہدہ کے باوجود ان کاموں کے دیکھنے سے صبر نہ کر سکے اور ان سے پوچھتے رہے کہ ایسا کیوں کیا۔ ان کے اسرار غیب سے پردہ ہٹا دینے پر حضرت موسیٰ کو ان کاموں کی حکمت معلوم ہوئی۔ اس سرگزشت سے یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ اس دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ سب ارادۂ الٰہی کے تحت ہوتا ہے اور ارادہ الٰہی سرتاسر حکمت و خیر پر مبنی ہوتا ہے۔ اس دنیا میں بظاہر سرکشوں اور نافرمانوں کو ڈھیل ملتی ہے اور اہل حق مختلف قسم کی آزمائشوں میں مبتلا کیے جاتے ہیں۔ اس صورت حال میں بہت سے لوگوں کے ایمان متزلزل ہو جاتے ہیں اور ان کے لیے جادۂ حق پر ثابت قدم رہنا نہایت ابتلا کا کام بن جاتا ہے۔ اس ابتلا میں ثابت قدم صرف وہی لوگ رہتے ہیں جن پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو کہ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے سب ارادہ الٰہی کے تحت اور اس کی حکمت کے تقاضوں کے مطابق ہو رہا ہے۔ لہٰذا آدمی

ناساعد حالات سے دل شکستہ نہ ہو اور موقف حق پر عزم کے ساتھ جما رہے اور حکمت الٰہی کے ظہور کا صبر کے ساتھ انتظار کرے۔ یہ سرگزشت آنحضرت ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کو اس مقصد سے سنائی گئی ہے کہ باغیوں اور نافرمانوں کو جو دندناتے دیکھ رہے ہو اور تم حق پر ہوتے ان کے مظالم کا جو ہدف بنے ہوئے ہو اس سے ہراساں و مرعوب نہ ہونا۔ اس دنیا میں اگر مسکینوں کی کشتی میں چھید کیا جاتا ہے تو اس میں بھی حکمت و خیر ہوتی ہے اور اگر ظالموں کی کسی بستی میں کسی گرتی دیوار کو سہارا دیا جاتا ہے تو اس میں بھی خیر ہی مضمر ہوتا ہے لیکن انسان کا محدود علم خدا کے سارے اسرار کا احاطہ نہیں کر سکتا۔

نبی ﷺ نے جب عرب کے بت کدے میں توحید کی اذان بلند کی اور مشرکین عرب کے مشرکانہ عقائد پر ضرب لگانا شروع کی تو شرک کے علمبردار آستینیں چڑھا کر آپؐ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ حضورؐ کی عقل و فطرت کو اپیل کرنے والی دعوتِ توحید سے بہت سے عرب قبائل کے نوجوان متاثر ہو کر حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ یہ بات رؤسائے عرب اور قریش کے لیڈروں کے لیے سخت باعث تشویش تھی۔ انہوں نے اپنی نوخیز نسل کو اس دعوت سے باز رکھنے کے لیے ان پر سختیاں شروع کر دیں اور بعض نوجوانوں کو ایمان کی پاداش میں گھر سے نکال دیا گیا۔ ان حالات میں سورہ لقمٰن نازل ہوئی جس میں عرب کے مشہور فلاسفر اور حکیم حضرت لقمان کی اپنے بیٹے کے لیے شاندار وصیت کا تذکرہ کیا گیا۔ اس حوالہ سے مقصود اہل عرب کے سامنے خود ان کے حکماء اور ان کی حکمت کو پیش کر کے یہ دکھانا ہے کہ تمہارے اندر جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی حکمت و معرفت میں سے کچھ حصہ ملا انہوں نے بھی اپنے متعلقین کو انہی باتوں کی تعلیم دی جن کی تعلیم تم کو یہ پرحکمت کتاب قرآن مجید دے رہا ہے، لیکن یہ تمہاری بدبختی و محرومی ہے کہ تم اپنے آباء و اجداد کی اندھی تقلید پر تو بہت نازاں ہو جنہوں نے بے سوچے سمجھے شیطان کی پیروی کی لیکن اپنے ان اسلاف کی حکمت سے تم نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جنہوں نے زندگی کے حقائق پر سنجیدگی سے غور کیا اور اپنے قول و عمل سے اپنے بعد والوں کے لیے نہایت پاکیزہ روایات چھوڑیں۔ اس بے خودی کا نتیجہ تمہارے سامنے یہ آیا کہ جن باتوں کی لقمان اپنے سعادت مند بیٹے کو نہایت دردمندی کے ساتھ تعلیم دیتے تھے انہی باتوں سے آج تم اپنی اولاد کو روکنے کے لیے نہایت ظالمانہ سزائیں دیتے ہو۔

سورۃ سبا کی آیات ۱۰ تا ۲۱ میں تاریخ سے دو مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ پہلی مثال حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کی ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے عظیم بادشاہی، عظیم علم و حکمت اور آسمان و زمین کی بے شمار نعمتوں سے سرفراز کیا اور وہ ان نعمتوں کو پا کر طغیان و فساد میں مبتلا نہیں ہوئے بلکہ برابر اپنے رب کے شکرگزار اور فرمانبردار رہے۔ ان کی اس شکرگزاری کا صلہ اللہ تعالیٰ نے یہ دیا کہ ان کے لیے نعمتوں میں

برابر اضافہ ہوتا رہا۔ دوسری مثال اہل سبا کی ہے ان کو بھی ایک نہایت آباد و زرخیز ملک کی حکومت ملی لیکن وہ اس کو پا کر طغیان و فساد میں مبتلا ہو گئے بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک سیلاب بھیج کر اس طرح ان کو تباہ کر دیا کہ وہ ایک داستان پارینہ بن کر رہ گئے۔

یہ دونوں مثالیں قریش کے مترفین و متکبرین کے سامنے پیش کی گئی ہیں جو نبی ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کے سامنے اپنے تکبر و گھمنڈ کا اظہار کر رہے تھے اور دعوت حق کو جھٹلا رہے تھے۔ ان مثالوں سے گویا ان کے سامنے یہ بات رکھی گئی کہ یہ دونوں راہیں ان کے لیے بھی کھلی ہوئی ہیں وہ چاہیں تو حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کی طرح خدا کے شکر گزار رہ کر اپنے آپ کو خدا کی نعمتوں کا حقدار بنا سکتے ہیں اور چاہیں تو اہل سبا کی روش اختیار کر کے اس کے قہر کو بھی دعوت دے سکتے ہیں۔ ساتھ ہی اس میں یہ تذکیر بھی ہے کہ جب اس دنیا میں خدا کے قانون مجازات کے ظہور کی یہ مثالیں موجود ہیں تو آخرت میں اس کے ظہور کو کیوں بعید خیال کرتے ہو۔

یہ چند واقعات قرآن کا فلسفہ تاریخ مبرہن کرنے کے لیے بیان کیے گئے ہیں ورنہ قرآن مجید میں اور بھی متعدد واقعات اور قصے بیان ہوئے ہیں جیسے قصہ آدمؑ و ابلیس، آدمؑ کے دو بیٹوں ہابیل اور قابیل کا واقعہ، حضرت ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کا واقعہ ذبح۔ تاریخ بنی اسرائیل میں واقعہ ذبح، بقرہ، گوسالہ پرستی اور قصہ ہاروت و ماروت، طالوت اور جالوت کی جنگ، سلطان عادل ذوالقرنین کا واقعہ، یاجوج ماجوج کی داستان، حضرت مریمؑ اور عیسیٰؑ کے حالات و واقعات اور اصحاب الفیل کا واقعہ وغیرہ۔ ان تمام واقعات اور قصوں کا اصل مقصد وہی ہے اور ان میں وہی فلسفہ روح کی طرح جاری و ساری ہے جو اوپر بیان کیا گیا۔ ان میں عبرت و موعظت، تعلیم و تذکیر اور اللہ کی اس سنت کے سارے پہلو مضمر ہیں جس کے تحت حق و باطل کے معرکے میں وہ باطل کو شکست دیتا ہے اور حق کو غلبہ دیتا ہے۔ ان واقعات سے درس عبرت حاصل کرنے کے لیے قرآن کریم انفس و آفاق کے دلائل پر غور و تفکر کے علاوہ انسان کی عقل قوت کو اس جانب بھی متوجہ کرتا ہے کہ وہ تاریخی مراحل میں قوموں کے اندر جاری اللہ کی سنت پر غور و تدبر کرے اور ان کے اندر اپنے لیے عبرت کا سامان تلاش کرے۔ مثلاً فرمایا:

> ''تم سے پہلے بہت سے دور گزر چکے ہیں۔ زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہوا۔ جنہوں نے اللہ کے احکام و ہدایات کو جھٹلایا۔ یہ لوگوں کے لیے ایک صاف اور صریح تنبیہ ہے اور جو اللہ سے ڈرتے ہوں ان کے لیے ہدایت اور نصیحت''۔ (آل عمران:۱۳۷۔۱۳۸)

سورہ الروم کی آیات ۹ اور ۱۰ میں ارشاد ہوتا ہے:

> ''کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ وہ دیکھتے کہ کیسا انجام ہوا ان لوگوں کا جو ان سے پہلے تھے۔ وہ ان سے قوت میں زیادہ اور زمین کو زرخیز بنانے اور آباد کرنے میں ان سے بڑھ چڑھ کر تھے اور ان کے پاس ان کے رسول واضح نشانیاں لے کر آئے۔ پس اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہیں تھا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے پھر ان لوگوں کا انجام جنہوں نے بری روش اختیار کی برا ہوا بوجہ اس کے کہ انہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا اور ان کا مذاق اڑاتے رہے''۔

اس مضمون کی آیات قرآن میں بار بار بیان ہوئی ہیں۔ قرآن مجید کی یہ تکرار اور دعوت فکر اس امر پر مجبور کرتی ہے کہ انسان اپنی پچھلی تاریخ کا مطالعہ کرے اور مختلف قوموں کی تباہی کے اسباب و عوامل کا بصیرت کے ساتھ مطالعہ کرے اور اس مطالعہ و تفکر کا مقصد عبرت و موعظت ہو۔ محض چٹخارے کے لیے یا علمی شان دکھانے کے لیے تاریخ کا مطالعہ نہ ہو اور یہی قرآن کے فلسفۂ تاریخ کا ہدف ہے۔

ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر

محبوب سبحانی

صور ثانی

دوسری مرتبہ جب صور پھونکا جائے گا تو دفعتاً مردے قبروں سے فوج در فوج ٹڈیوں کی مانند برآمد ہوں گے اور بلا پس وپیش اللہ تعالیٰ کے داعی کی طرف چل کھڑے ہوں گے۔

''جس دن صور پھونکا جائے گا تو تم آؤ گے فوج در فوج''۔ (انبیاء:۱۸)

قیامت کے دن ہر شخص اپنے اعمال کی جواب دہی کے لیے اپنے رب کے حضور تنہا حاضر ہوگا جس طرح وہ پہلی بار تنہا پیدا ہوا تھا۔ فرمایا:

''اور ان میں سے ہر ایک اپنے رب کے سامنے حاضر ہوگا تنہا''۔ (مریم:۹۵)

نیز فرمایا:

''اور تم آئے ہمارے پاس تنہا تنہا جس طرح ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا''۔ (الانعام:۹۴)

نفسا نفسی:

قیامت کی ہولناک کڑک کے بعد جو دن آئے گا وہ ایسا ہولناک ہوگا کہ ہر ایک پر نفسا نفسی کی حالت طاری ہوگی۔ اس دن لوگ پراگندہ پتنگوں کے مانند ہوں گے نہ کسی کے ساتھ اس کا خاندان اور قبیلہ ہوگا نہ کسی کی کوئی جماعت وجمعیت ہوگی۔ نہ بھائی اپنے بھائی کی فریاد سنے گا نہ بیٹا اپنے ماں باپ کی دہائی پر کان دھرے گا اور نہ کوئی اپنی بیوی اور بیٹوں کی مصیبت میں ان کا شریک بننے کا حوصلہ کرے گا۔ اس دن ہر شخص کو اپنی ہی ایسی پڑی ہوگی کہ کسی دوسرے کی نیز نے کا وہ کوئی تصور ہی نہ کر سکے گا خواہ وہ کتنا ہی قریبی عزیز ہو۔ اسی کی نظر میں اس کے محبوب مال کی بھی کوئی وقعت باقی نہیں رہے گی۔ اس دن نہ وہ شرکاء و شفعاء ہی ہوں گے جن کے اعتماد پر لوگ نچنت ہیں بلکہ لوگ متفرق نکلیں گے۔ ہر ایک کو سابقہ صرف اپنے اعمال سے پیش آئے گا۔ سورہ عبس میں فرمایا:

''اس دن آدمی اپنے بھائی، ماں باپ اور اپنی بیوی اور بیٹوں سے بھاگے گا۔ اس دن ہر ایک کو اپنی پڑی ہوگی''۔ (عبس:۳۷ـ۳۴)

البتہ وہی لوگ اس دن کی ہلچل سے مامون رہیں گے جو نیکی کا توشہ لے کر آئیں گے ان کے لیے بہتر صلہ ہوگا اور وہ اس دن کی گھبراہٹ سے بالکل مامون ہوں گے۔ فرمایا:

''جو نیکی کے ساتھ حاضر ہوں گے تو ان کے لیے اس سے بہتر صلہ ہے اور وہ اس دن کی گھبراہٹ سے مامون رہیں گے''۔ (نحل:۸۹)

جہنم اچانک نمودار ہوگی:

اس دن کی ہلچل کے بعد جہنم اچانک اس طرح نمودار ہو جائے گی کہ گویا وہ سرکشوں کا ٹھکانہ بننے کے لیے اس ہلچل کی آڑ میں گھات میں بیٹھی ہوئی تھی۔ خدا کو اس کے لیے نہ کوئی تیاری کرنا پڑے گی اور نہ سرکشوں کو اس کی تیاری کے انتظار میں کوئی مہلت ملے گی۔ آج تو آخرت اور جہنم بعید از امکان نظر آتی ہیں، لیکن اس روز یہ جہنم ان لوگوں کے لیے بے نقاب کر دی جائے گی جن کو ان سے دوچار ہونا ہے۔ بس پردہ اٹھنے کی دیر ہوگی جس کے اٹھتے ہی وہ ان کے سامنے ہوگی جس کو دیکھے بغیر وہ اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ فرمایا:

''بے شک جہنم گھات میں ہے۔ سرکشوں کا ٹھکانہ۔ اس میں رہیں گے مدتہائے دراز''۔ (النبا:۲۳ـ۲۱)

اس دن اہل کفر کے چہروں پر خاک اڑ رہی ہوگی اور سیاہی چھائی ہوئی ہوگی اس لیے کہ ان پر امید کے تمام دروازے بند ہو چکے ہوں گے۔ اس کے برعکس اس دن اہل ایمان کے چہرے روشن اور تابناک ہوں گے وہ ہشاش بشاش ہوں گے۔ ان کے دل امید اور حوصلوں سے معمور ہوں گے۔

تین گروہوں میں تقسیم:

قیامت کے دن انسانوں کو تین گروہوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ ایک گروہ اصحاب المیمنہ کا ہوگا دوسرا گروہ اصحاب المشئمہ کا ہوگا اور تیسرا سابقون پر مشتمل ہوگا۔ فرمایا:

''تم تین گروپ میں تقسیم ہو جاؤ گے۔ ایک گروہ داہنے والوں کا ہوگا تو کیا کہنے داہنے والوں کے دوسرا گروہ بائیں والوں کا ہوگا تو کیا حال ہوگا، بائیں والوں کا۔ رہے سابقون تو وہ تو سبقت کرنے والے ہی ہیں''۔ (الواقعہ:۱ـ۷)

اصحاب المیمنہ:

یہ وہ لوگ ہوں گے جن کے اعمال نامے دائیں ہاتھ میں پکڑائے جائیں گے۔ یہ لوگ بے حد خوش ہوں گے اور خوش خوش لوگوں سے کہیں گے یہ لو میرا نامہ اعمال پڑھو میں دنیا میں برابر اندیشہ ناک رہا کہ بالآخر مجھے اپنے اعمال کے حساب سے دوچار ہونا پڑے گا۔ قرآن نے بیان کیا ہے کہ داہنے ہاتھ والوں کی شان وعظمت، ان کے عیش جاوداں، ان کی رفاہیت وخوش حالی اور ان کی عالی شان کا کیا پوچھنا۔ ان کو فرشتوں کی طرف سے داد ملے گی کہ اے صاحب یمین تیرے لیے سلامتی ومبارکبادی ہے۔ چنانچہ فرمایا:

''تو اس دن جس کا اعمال نامہ اس کے داہنے ہاتھ میں پکڑایا جائے گا وہ لوگوں سے

خوش ہو کر کہے گا کہ یہ لو میرا اعمال نامہ پڑھو میں دنیا میں برابر اندیشہ ناک رہا کہ
بالآخر مجھے اپنے حساب سے دوچار ہونا ہے"۔ (الحاقہ: ۲۰-۱۹)

اصحاب الیمین عام مسلمانوں کے مفہوم میں نہیں ہیں بلکہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے اعمال نامے بطور اعزاز داہنے ہاتھ میں دیے جائیں گے اور جو اپنے شاندار کارناموں پر نہایت شاداں و فرحاں ہوں گے۔

اصحاب المشئمہ:

اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے اعمال نامے بائیں ہاتھ میں پکڑا دیے جائیں گے۔ ایسے لوگ انتہائی مایوس اور دل شکستہ ہو کر کہیں گے کہ کاش میرا اعمال نامہ مجھ کو ملتا ہی نہیں اور مجھ کو یہ خبر ہی نہ ہوتی کہ میرا حساب کیا ہے۔ اے کاش کہ پہلی موت ہی فیصلہ کن بن گئی ہوتی۔ میرا مال کچھ کام نہ آیا۔ میرا اقتدار ہوا ہو گیا۔ قرآن میں صراحت ہے کہ ان سے اظہار نفرت و کراہت کیا جائے گا۔ ان کی بدبختی، ان کی ذلت و مصیبت اور ان کی بد انجامی کا جو حال ہو گا اس کی تصویر الفاظ میں کھینچی نہیں جا سکتی اس کا اندازہ ان ہی کو ہو گا جن کو اس سے سابقہ پیش آئے گا۔ سورہ الحاقہ میں فرمایا:

"تو وہ کہے گا کہ کاش میرا اعمال نامہ مجھے ملتا ہی نہیں اور مجھ کو یہ خبر ہی نہ ہوتی کہ میرا حساب کیا ہے۔ اے کاش پہلی موت ہی فیصلہ کن بن گئی ہوتی! میرا مال میرے کچھ کام نہ آیا، میرا اقتدار ہوا گیا"۔ (الحاقہ ۲۹-۲۵)

سابقون:

اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے دعوت حق کو قبول کرنے میں سبقت کی اور اس دور میں اپنے جان و مال سے اس کی خدمت کی توفیق پائی جب اس کی خدمت کرنے والے تھوڑے تھے اور اس کی مدد کے لیے حوصلہ کرنا اپنے آپ کو جوکھوں میں ڈالنا تھا۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ سابقون لازماً ایسے درجہ اور مرتبہ کو پہنچیں گے جو انسانی شرف کا آخری نقطہ ہے۔ اس نقطۂ کمال کا اندازہ اس عالم ناسوت میں کون کر سکتا ہے۔ یہی گل سرسبد اور سرخیل قافلہ ہوں گے۔ قرآن میں بیان کیا گیا ہے کہ انہیں مقربین کا درجہ حاصل ہو گا جن کا ٹھکانہ جنت نعیم ہو گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مقربین الٰہی کے لیے خاص ان کے درجے اور مرتبے کے لحاظ سے جنتیں ہوں گی۔ ان میں زیادہ تعداد تو اگلوں کی ہو گی اور ایک قلیل تعداد پچھلوں کی بھی ہو گی۔ فرمایا:

"رہے سابقون، تو... سبقت کرنے والے ہی ہیں وہی لوگ مقرب ہوں گے نعمت کے باغوں میں ان میں بڑی تعداد اگلوں کی ہو گی اور تھوڑے پچھلوں میں سے ہوں گے"۔ (الحاقہ ۱۴:۱۰)

امین احسن اصلاحیؒ

اسلام اور جمہوریت

سوال: حقیقی جہاد وہ ہوتا ہے جو بے غرض اور بلا معاوضہ ہو اور وہ مجاہدین کی جماعت کرتی ہے۔ تنخواہ دار فوج کا اسلام میں کیا حکم ہے؟

جواب: فوج تنخواہ دار نہیں ہو گی تو آپ کو خمس نکال کر باقی حصہ انہیں دینا پڑے گا۔ اس لیے کہ فوج فرشتوں کی تو نہیں ہو گی، بہرحال ہم پر ہی مشتمل ہو گی، وہ کھائے گی، پیئے گی اس کے بیوی بچے مکان وغیرہ سب چیزیں ہوں گی۔ آپ تنخواہ دار فوج رکھیں گے یا چوتھ دیں گے۔ چوتھ دینے کا نظام بدویانہ زندگی میں چل سکتا ہے، اب نہیں۔ بدویانہ دور زندگی میں جنگی معیار کی مہارت لوگ انفرادی طور پر حاصل کر لیتے تھے۔ تلوار، تیر، نیزہ اور مختلف قسم کے ہتھیار لوگوں کے پاس ہوتے تھے اور اب یہ چیزیں تو کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ اب تو Standing Army لازم اور جنگ کا پیشہ مشکل اور پیچیدہ ہو گیا ہے۔ اس کو سیکھنے کے لیے طویل اور نہایت اعلیٰ ٹریننگ کی ضرورت ہے۔ فوج کی ٹریننگ اور جدید ہتھیاروں کی سپلائی کے لیے قوموں کے بجٹوں کا ایک بڑا حصہ مختص ہوتا ہے۔

بے غرض ہونے کے لیے ضروری نہیں کہ آدمی کھانا، پینا، پہننا اوڑھنا سب چھوڑ دے۔ بے غرض کے معنی یہ ہیں کہ غرض تو صرف رضائے الٰہی ہو باقی لوازمات، ضروریات زندگی تو بہرحال پورے کرنے پڑیں گے۔ تنخواہ دار فوج کا کیا حکم ہے؟ وہی حکم ہے جو مجاہد فی سبیل اللہ کا ہے۔ البتہ یہ ہے کہ مقصد، نصب العین، زندگی کا طور طریقہ فوج کو اسلامی اختیار کرنا پڑے گا۔ چاہے کچھ ہو جائے میدان جنگ میں بھی نماز ادا کی جائے اور ان تمام قواعد و ضوابط کی پابندی کرنی پڑے گی جو دین کے احکام ہیں۔

سوال: من فارق الجماعت فقد هلک الجماعت سے کیا مراد ہے؟

جواب: ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جو جماعت قائم کی ہے اسی پر اس کا اطلاق ہو گا اس لیے کہ ایک معصوم کی قائم کی ہوئی جماعت صحیح بنیاد پر، صحیح حق پر اور صحیح دین پر ہے۔ اس کے علاوہ لوگوں نے جو جماعتیں قائم کی ہیں تو کم از کم وہ جماعت جو اس حق مبین پر ہے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے دیا ہے وہ جماعت ہے اور پھر یہ ہے کہ وہ با اختیار ہو، باقاعدہ اور منظم ہو اور وہ اپنے اختیار کو استعمال کر سکتی ہو، اس

میں کوئی مانع نہ ہو۔ سمع وطاعت کا حق بھی اسی کا ہے اور اسی کا حق ہے کہ وہ ہجرت اور جہاد کی بیعت لے۔

سوال:۔ انسان کی فطرت میں نیکی اور بدی کی تمیز رکھ دی گئی ہے، لیکن انسانی تاریخ بتاتی ہے کہ اسی انسان نے سب سے بڑھ کر ظلم وستم ڈھائے یہاں تک کہ خون کی ندیاں بہادیں اور یہ سلسلہ اس ترقی یافتہ دور میں اور تیز ہوگیا ہے۔ اس پر روشنی ڈالیے۔

جواب:۔ اس پر روشنی تو آپ ہی نے ڈال دی ہے۔ واقعہ ہے کہ انسانی فطرت میں نیکی اور بدی کی جو تمیز رکھ دی گئی ہے اس سے تو آپ کو انکار نہیں ہے۔ اس سوال کو الگ رکھیے کہ نیکی اور بدی کا شعور رکھتے ہوئے انسان نے اتنی بدی کا اودھم کیسے مچایا ہے۔ اس کا جواب قرآن مجید نے بہت تفصیل کے ساتھ دیا ہے۔ اس سے یہ واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ نیکی اور بدی کا شعور دے کر انسان کو اس دنیا میں ایک امتحان میں ڈالا گیا ہے اور یہ کہ نیکی کے اوپر وہ مجبور نہیں کردیا گیا ہے اور نہ ہی بدی کے اوپر بلکہ بہرحال اس کو آزادی ملی ہے کہ ان میں سے جس کو چاہے وہ اختیار کرے۔ اور جس کو وہ اختیار کرنے کا ارادہ اور کوشش کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے اس میں تیسیر کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر برائی کو وہ اختیار کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے وہ اس کو ڈھیل دے دیتا ہے اگر اس کی حکمت کا تقاضا ہوتا ہے۔ اگر نیکی پر مجبور کردیا جاتا تو انسان میں اور جانور میں کوئی فرق نہیں رہتا اس لیے کہ جانور اپنی جبلت پر ہے اور آپ بھی ہوتے۔ آپ اپنی فطرت کی پابندی کرنے کے معاملہ میں اختیار استعمال کرتے ہیں اور اپنے اختیار کے سوئے استعمال سے آپ اپنی شامت بلاتے ہیں۔ اب وہ تاج جو آپ کو پہنایا ہے اس کی حیا اور لاج رکھنا آپ کا کام ہے۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے بہت انتظام کیا ہے۔ ایک تو فطرت میں حق وباطل میں تمیز کی صلاحیت رکھ دی، اس کے بعد انبیاء اور رسل بھیجے، صحیفے اور کتابیں اتاریں تاکہ انسانوں پر فطرت کی چیزیں واضح کردیں۔ رسولوں نے اپنے اپنے زمانوں میں جان کی بازی کھیل کر یہ کام کیا۔ آخری نبی ہمارے رسول ﷺ ہیں اور پھر اس امت کو یہ شرف بخشا کہ تم اب قیامت تک حق کی گواہی دینے والے ہو۔ آخری کتاب قرآن مجید کو محفوظ کردیا اور اس امت کے اندر یہ انتظام کردیا کہ اس کے اندر حق کے بتانے والے ہر حال میں رہیں گے چاہے کتنی ہی تاریکی بڑھ جائے۔ اب یہ آپ کا کام ہے کہ حق اور باطل میں تمیز کی اپنی صلاحیت کو استعمال کریں اور حق جہاں آپ کو نظر آئے چھوٹا ہو یا بڑا اس کے آگے سر جھکادیں۔ جب تک آپ یہ نہیں سیکھیں گے تو اللہ تعالیٰ کو آپ کی کوئی پرواہ نہیں۔ آپ اس کے قابو سے باہر نہیں ہوجائیں گے جب چاہے گا پکڑ لے گا۔

اگر آپ یہ کہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اوپر حجت تمام کرنے کے لیے انتظام نہیں کیا تو آپ کا یہ اعتراض درست نہیں ہوتا۔

سوال:۔ کیا اسلام اور جمہوریت میں فرق ہے؟

جواب:۔ تاریکی اور روشنی میں، رات اور دن میں، بدی اور نیکی میں جو فرق ہے وہی جمہوریت اور اسلام میں ہے۔ آپ فلسفہ کی رو سے بھی غور کرلیں۔ آپ جمہوریت کی تعریف کریں۔ عوام کی حکومت، عوام کے لیے، عوام کے ذریعہ سے عوام کی بہبود کے لیے، یہی تعریف ہے آپ کسی جگہ پڑھ لیجیے۔ اسلام میں اللہ کی حاکمیت، اللہ کی حکومت، اللہ کے قانون کے ذریعہ سے، اللہ کے ماننے والوں کے لیے، موٹی سی یہ تعریف ہے، کہیں پڑھ لیں۔ اب ان دونوں میں ذرا جوڑ ملائیے۔ ہے کوئی جوڑ ملتا ہوا، کوئی تک ہے۔

جمہوریت کی نمائش کی گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انگریزوں اور امریکنوں نے ایک نظام چلا کر ساری دنیا کو مبہوت کردیا ہے، لیکن حالت کیا ہے۔ آپ یقین کریں کہ بڑے بڑے سرمایہ داروں کی بڑی بڑی لابیاں ہوتی ہیں اور ان کے ہاتھ میں تمام پبلسٹی کے ذرائع ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے ماہران کے ملازم ہوتے ہیں اور وہ جس شیطنت کو پھیلانا چاہیں پھیلا دیتے ہیں۔ اس جمہوریت کے متعلق گزشتہ جنگ عظیم کے فاتح چرچل وڈیگال وغیرہ نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا تھا کہ جمہوریت نازک حالات میں نہیں چل سکتی۔ اس زمانے میں صرف آمری حکومت کرسکتا ہے، ان کا یہ فیصلہ تھا کہ یہ چیزیں سب ایک سراب ہیں۔

اسلام کا اپنا الگ نظام ہے۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ اس کی بنیاد بہرحال ایک نظام پر ہوگی لیکن اس کی شکل ایمانی ہوگی، اس کی بنیاد علم وتقویٰ پر، اہل استنباط پر اور شورائیت پر ہوگی۔ خلیفہ کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ تمام اہم معاملات میں اہل استنباط سے مشورہ کرے اور وہ قوم کے معتمد لوگ ہوں گے جو کتاب وسنت کی روشنی میں فیصلہ کریں گے۔ اس کے لیے آج کے زمانے میں بھی ایک نظام بنایا جاسکتا ہے اور پہلے بھی تھا۔ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور خلفائے راشدین کے زمانے میں رہا ہے۔ اس کے بعد کے زمانے میں بعض خصوصیات مٹ گئیں، لیکن بہت سی خصوصیات باقی رہی ہیں۔ بنوامیہ کے زمانے میں بہت سی خصوصیات رہیں۔ قانون کا مرجع کتاب وسنت تھا اور اس میں اشخاص کی مرضی کو بالکل دخل نہیں تھا۔ اس زمانے میں حنفیت، شافعیت اور مالکیت کے جھگڑے تو نہیں تھے، کتاب وسنت تھی۔

یہ بات بھی میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ اسلام کو بادشاہ سے کوئی کد نہیں۔ بادشاہ کو عادل ہونا چاہیے، شریعت کا پابند ہونا چاہیے۔ خلیفہ ہو تو وہ اللہ کے قانون کو شریعت کو جاری کرنے والا ہوتا ہے اور شوریٰ کا پابند ہوتا ہے۔ شوریٰ کے لیے ضروری ہے کہ اللہ کے قانون کے تابع ہو اور اجتہاد پر مبنی ہو۔ اجتہاد کے لیے ضروری ہے کہ اہل علم، اہل استنباط اور اہل الرائے اس کے ممبر ہوں۔

دو چیزوں کو خوب سمجھ لیجیے، ایک حقوق ہیں اور دوسرے فرائض۔ حقوق میں ملک کی سب رعایا،

چھوٹے بڑے، امیر غریب سب شریک ہوں گے۔ ہر ایک کا حق ہے۔ روٹی ملنی چاہیے، تعلیم کا انتظام ہو، عدالت سے انصاف ملنا چاہیے اور عزت و ناموس محفوظ ہو۔ اگر اقلیتیں ہیں تو ان کے پرسنل لاء کی حفاظت کی جائے گی اس میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آئے گا۔ اور جہاں تک فرائض کا تعلق ہے وہ میرٹ اور صلاحیت پر مبنی ہیں۔ جس کے سپرد فرائض ہوں گے اس میں اس کی اہلیت ہونی چاہیے اور اہلیت کو متعین کرنے کے لیے ہر نظام میں طریقہ ہوتا ہے۔

سوال:۔ بزرگوں کی قبروں پر جانا، فاتحہ کہنا اور دنیاوی کام کے لیے دعا کرنے کے لیے کہنا، قرآن اور سنت کی روشنی میں کس حد تک جائز ہے۔ روضۂ رسول کی حاضری کس زمرہ میں آتی ہے اور وہاں جا کر کیا پڑھنا چاہیے۔ ذرا تفصیل سے بیان کریں کیونکہ ہماری اکثریت اس سے ناواقف ہے۔

جواب:۔ یہ واقعہ ہے کہ لوگوں کے مسائل یہی ہیں اور یہ بات بھی ہے کہ لوگ اچھی خاصی تفصیل سے بیان کرتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک تو سمجھ لیجئے کہ بزرگوں کی قبروں پر جانا ہی اصل چیز ہے۔ میں نے جو کچھ قرآن و حدیث میں پڑھا ہے وہ یہ ہے کہ قبرستان میں جانا چاہیے تاکہ موت یاد آئے۔ قرآن پاک میں بھی اشارے ملتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اصل تذکیر ہوتی ہے تو قبرستان میں جا کر ہوتی ہے۔ وہاں امیر غریب بزرگ کسی کا امتیاز نہیں اور وہاں جا کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ انجام ہے، یہاں آنا ہے۔ آپ دعا بھی پڑھتے ہیں کہ **السلام علیکم یا اهل القبور و انا انشاء الله بکم لاحقون**، ہم بھی یہاں آنے والے ہیں۔ یہ ثابت ہے اور ہر ایک کو کرنا چاہیے۔ رہ گیا بزرگوں کی قبروں پر جانا تو بزرگوں نے جو کچھ کیا وہ اپنے لیے کیا ہے، آپ کے لیے وہ کیا کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے تو اپنا قاعدہ یہ بتایا ہے کہ وہ خود راہ بھی ہوں منزل بھی ہوں، اگر کوئی کچھ پانا چاہتا ہے تو مجھ سے تعلق پیدا کرے، میرے اوپر ایمان لائے۔ جو کچھ بھی ملے گا خواہ سوئی دھاگہ ہی کیوں نہ ہو اللہ تعالیٰ ہی سے ملے گا۔ قبروں پر جانے کا شوق ہے تو قبرستانوں میں جایئے اور اس کے سوا قبروں پر جانے کا کوئی ثواب نہیں ہے اور دنیاوی کام کے لیے کہنا یہ اور بھی حماقت ہے۔ دنیاوی کام کے لیے آپ تدبیر کیجئے، محنت کیجئے اور اللہ سے دعا کیجئے، قرآن اور سنت کی روشنی میں یہی بات ہے۔

آنحضرت ﷺ کے واسطہ ہی سے ہمیں ہدایت ملی ہے اور ان کا ہم پر بڑا احسان ہے جو ادب ہمیں قرآن مجید میں بتایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ نبی ﷺ پر درود بھیجنا چاہیے جو کہ نمازوں میں ہم اس کی پابندی کرتے ہیں۔ اگر کسی شخص کو مدینہ منورہ جانے کا موقع ملے تو اس کے لیے سعادت ہے کہ مسجد نبوی کی زیارت کرے اور نبی ﷺ کی قبر پر بھی جائے۔ یہ سعادت ہے، فرض اور واجب نہیں ہے۔ نبی ﷺ

ہمارے ہادی ہیں، وہاں جایئے تو درود شریف پڑھیے اور اگر دعا بھی کریں تو یہ کریں کہ اے رب مجھے ہدایت دے کہ جس پیغمبر کا میں امتی ہوں اس کی ہدایت پر زیادہ سے زیادہ عمل کرنے کی مجھے توفیق حاصل ہو۔ پیغمبر کے لیے آپ جو کچھ چاہ سکتے ہیں وہ درود شریف میں موجود ہے اور یہی اللہ تعالیٰ کی تعلیم ہے۔

سوال:۔ کیا اسلامی نظام اتنا ہی ناقابل عمل ہے کہ ساری دنیا میں کہیں بھی صحیح شکل میں نافذ نہیں ہے؟

جواب:۔ اسلامی نظام کے متعلق یاد رکھیے کہ یہ دنیا کے تمام نظاموں کی طرح سے ہے اور یہ کوئی خودکار نظام نہیں ہے۔ اس کو قائم کرنے کے لیے ایک صالح، مستعد اور معقول معاشرہ کو جدوجہد کرنی پڑتی ہے اور ہر نظام اسی طرح قائم ہوتا ہے۔ یہ ایک انفرادی فعل نہیں ہے بلکہ اجتماعی اور معاشرتی فعل ہے۔ اس کے لیے ایک شخص کی کوشش تو صرف دعوت دینے کی ہو سکتی ہے۔ ایک چھوٹی جماعت کا کام بھی یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اس کی دعوت دے۔ میرے جیسے ملا کا فرض بھی اتنا ہی ہو سکتا ہے کہ میں اس کو واضح کرنے کی کوشش کروں، لیکن اسلامی نظام قائم کرنا ان لوگوں کے بس میں ہوتا ہے جو ایک ایسا معاشرہ بن جاتے ہیں کہ جس کے اندر اتنی قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ ایک سیاسی نظام بن جاتا ہے۔ آج جو قرآن کا درس آپ نے پڑھا ہے اس میں واضح ہے کہ اللہ کا نبی اللہ کے بندوں کے لیے جو نظام پیش کرتا ہے وہ کس اساس پر مبنی ہے۔ اس کی فطری اساس بتا دی ہیں اور اس کے مامورات اور منہیات بھی واضح کر دیے پھر اس کے تقاضے بیان کر دیے۔ اس کے تقاضوں میں یہ بات ابھرتی ہے کہ خاندان اس بنیاد پر ہونا چاہیے، معاشرہ اس بنیاد پر ہونا چاہیے، پاس پڑوس کے تعلقات اس طریقہ سے ہونا چاہیے اور اجتماعی زندگی کو اس طریقہ پر Dovelop ہونا چاہیے۔ یہ سب بتا دیا ہے۔ اس میں آپ بتایئے کہ خلا کیا ہے؟ اب یہ ہے کہ اگر فطرت کا تقاضا بھی ہے، عقل کا تقاضا یہی ہے اور عملاً دنیا میں یہ نظام قائم ہو چکا ہے اور بڑی وسیع دنیا پر قائم ہو چکا ہے اور یہ بات بھی ہے کہ اس سے زیادہ بہتر کوئی عدل و انصاف کا معاشرہ قائم نہیں ہوا تھا تو بتایئے کہ قصور کس کا ہے؟ ظاہر ہے کہ جہاں بھی یہ اسلامی نظام نہیں قائم ہے وہاں کے معاشرہ کی جہالت ہے اس کی نفس پرستی ہے، خواہش پرستی ہے۔ اگر یہ خودکار چیز ہوتا تو اس کو قائم ہو جانا چاہیے تھا، لیکن یہ تو ہمارے اور آپ کے کرنے کا کام ہے اور آپ خود پوچھتے ہیں کہ یہ نظام کیوں نہیں قائم ہے۔ جن صاحب نے سوال کیا ہے ان کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ وہ اپنے فرض کو سمجھیں کہ وہ کیا ہے۔ اپنا فرض یہ ہے کہ ٹھیک اس طریقہ کا آدمی بن کر جینا چاہیے کہ جس قسم کے آدمی ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے معاشرہ میں پیدا ہوں اور اسی کی کوشش کیجئے اور اسی کا راستہ دوسروں کو دکھایئے یہاں تک کہ یہ خوبی اور نیکی متعدی ہو جائے اور یہاں تک کہ ایک صالح معاشرہ وجود میں آ جائے کہ جس کے لیے فطرت کا تقاضا ہے تب اسلامی نظام قائم ہوگا۔

(یہ سوال مولانا امین احسن اصلاحی کے سورہ بنی اسرائیل کی آیات ۲۲ تا ۳۹ پر درس کے بعد اٹھایا گیا تھا۔

اس درس میں سورہ النحل کی آیت ۹۰ بھی زیر بحث آئی تھی)

سوال:۔ کیا قرآن میں منقول دعائیں نماز میں، جلسہ استراحت میں پڑھی جا سکتی ہیں کیونکہ اکثر علماء کہتے ہیں کہ ان دعاؤں کا پڑھنا رسول اللہ ﷺ کی سنت سے ثابت نہیں ہے۔

جواب:۔ ان سے پوچھیے کہ اگر قرآن سے ثابت ہے تو سنت رسول تو اس کے بعد ہے۔ یہ اکثر علماء کون ہیں؟ میرا خیال ہے کہ کسی ایسے آدمی نے کہا ہوگا جس کو کچھ پتہ نہیں ہے۔ میرے علم میں علماء سے منسوب ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

قرآن مجید میں جو دعائیں ہیں ان کے لیے سب سے زیادہ موزوں محل نماز ہو سکتی ہے۔ قرآن مجید میں حضرت یحییٰ کے متعلق آتا ہے کہ وہ محراب میں عبادت کر رہے تھے اور اسی وقت انہوں نے دعا کی تھی۔ معلوم ہوا کہ قرآن مجید کی دعائیں آپ جہاں چاہے پڑھ سکتے ہیں۔ یہ دعائیں نماز میں منقول بھی ہیں مثلاً رب ارحمھما کما ربینی صغیرا o والدین کے لیے جو دعا ہے، حضرت ابراہیم کی دعا وہ بھی ہم نماز میں پڑھتے ہیں۔ خاص خاص وقتوں کی جو دعائیں ہیں ان کے متعلق تو صحیح طریقہ یہ ہے کہ تہجد کی نماز میں اپنے رب کے آگے پیش کی جائیں۔

سوال:۔ دیت اور قصاص میں کیا فرق ہے؟

جواب:۔ دیت یہ ہے کہ مقتول کے ورثاء کو کوئی مالی معاوضہ دے کر کے تلافی کی جائے اور قصاص میں جان کا بدلہ جان بھی ہے اور مالی معاوضہ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ لفظ قرآن مجید میں دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ دیت، قصاص ہی کی شکل ہے۔ فرق صرف موقع و محل کا ہے۔ اصل چیز تو یہ ہے کہ جب قتل عمد نہیں ہے تب تو حق یہی ہے کہ جان نہ لی جائے بلکہ دیت لی جائے۔ اولیاء کو یہ اختیار ہونا چاہیے کہ وہ اپنی مصلحت کا تقاضا سمجھتے ہیں تو معاف بھی کر سکتے ہیں۔ یہ اختیار دے دینا بہت بڑا اختیار دینا ہے۔ گویا حکومت سارے اختیارات اولیاء کو تفویض کر دیتی ہے کہ آپ ان کو استعمال کر لیجیے اور جو آپ کی مرضی ہو گی وہ نافذ کی جائے گی، نافذ کرنا حکومت کا کام ہے۔ یہ بات بھی ہے کہ دیت کے بہت سارے معاملات ہیں کہ جو ایسے پیچیدہ ہیں کہ ہمارے معاشرہ میں وہ پورے نہیں ہوتے اس لیے کہ ہمارے ہاں زندگی کا وہ نظم نہیں ہے کہ جس میں ہر شخص کی عاقلہ معین ہو۔ یہ مشکل ہے، بتانا پڑے گا کہ اس کے عاقلہ یہ ہیں۔

حسان عارف

مقالات اصلاحیؒ جلد دوم

مولانا امین احسن اصلاحیؒ بڑے جید عالم دین تھے۔ وہ اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ تھے کہ اہل علم کی اصل ذمہ داریاں کیا ہیں اور علم کا عالم سے کیا تقاضا ہے۔ یہی آگہی تھی جس نے ان کی زبان اور قلم کو ابر گوہر بار بنا دیا تھا۔ مولانا اصلاحیؒ اپنی زندگی کے آخری دور میں خرابی صحت کی وجہ سے گوشہ نشین ہو گئے تھے، لیکن جب تک ان میں تازگی اور توانائی رہی، وہ اعلیٰ مقاصد کے لیے ہمیشہ متحرک رہے۔ وہ عالم باعمل تھے۔ انہوں نے تحریر و تقریر اور درس و تدریس کے ذریعے دینی علوم کی اشاعت و ابلاغ کے لیے بڑا کام کیا۔ مرحوم نے جو کچھ لکھا جانچ تول کر لکھا۔ اجتہادی اسلوب میں لکھا اور اس تڑپ کے ساتھ لکھا کہ وہ جو کچھ جانتے ہیں وہ ناظرین کے دل و دماغ میں اتر جائے اور عمل صالح کے برگ و بار لائے۔

جناب خالد مسعودؒ اپنے عظیم معلم کے عقیدت مند اور قدر شناس تھے۔ انہوں نے استاد گرامی کے جا بجا بکھرے ہوئے علوم کے موتی جمع کیے اور ''مقالات اصلاحی'' کے زیر عنوان شائع کر دیے۔ مقالات اصلاحی کی پہلی جلد ۱۹۹۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ دوسری جلد اب جلوہ گر ہوئی ہے۔ یہ کتاب خوبصورت ٹائٹل، معیاری کاغذ اور حسن طباعت کا دل نواز نمونہ ہے۔ جناب ماجد خاور کی وفات کے بعد اشاعت کا اہتمام ان کے بیٹے جناب حسن خاور نے کیا ہے اور ان ہی کے ادارے فاران فاؤنڈیشن ۱۳۲، فیروز پور روڈ، اچھرہ، لاہور سے کتاب شائع ہوئی ہے۔ قیمت ڈھائی سو روپے ہے۔

اس کتاب کے کچھ مضامین ماہنامہ 'الاصلاح' اعظم گڑھ، ماہنامہ 'معارف' اعظم گڑھ اور ماہنامہ 'میثاق' لاہور میں چھپے تھے۔ جناب خالد مسعودؒ نے مولانا کی بعض تقریریں اور انٹرویو بھی شامل اشاعت کر دیے ہیں۔ یہ تمام مضامین کم و بیش چالیس پچاس سال پرانے ہیں لیکن ان کی معنویت اور افادیت نامعلوم مدت تک تازہ رہے گی۔ ۴۳۲ صفحوں کی یہ درخشاں کتاب چھ حصوں پر مشتمل ہے جن میں چھوٹے بڑے ۴۷ مقالات شامل ہیں۔ حصہ ششم کے مقالوں میں مولانا اصلاحیؒ نے اپنے عہد کی اہم اور برگزیدہ شخصیات کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔ ان شخصیات میں مولانا محمد علی جوہر، علامہ اقبال، مولانا ابوالکلام آزاد، حضرت مولانا محمد یوسف، مولانا احمد علی لاہوری، مولانا داؤد غزنوی، حسین شہید سہروردی اور پنڈت جواہر لال نہرو جیسی شخصیات شامل ہیں۔ دیباچہ جناب محبوب سبحانی نے لکھا ہے جو بجائے خود ایک علمی شہ پارہ

ہے۔ سجانی صاحب نے کتاب کے مندرجات کی وضاحت اس سلیقے اور سلاست سے کی ہے کہ قارئین کے لیے اس کی تفہیم آسان ہوگئی ہے۔

'اسلامی معاشرے کا سب سے بڑا آدمی' ...... یہ کتاب کا پہلا مقالہ ہے جس میں مولانا اصلاحیؒ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عظیم الشان فضائل کا عطر نکال کر رکھ دیا ہے۔ انہوں نے حضرت ابوبکرؓ کے دور کے حالات و حوادث کے مفصل حوالے دیے ہیں اور بتایا ہے کہ خلیفہ اول کی فطرت نہایت پاکیزہ تھی۔ جب آنحضرت ﷺ نے دعوت اسلام دی تو حضرت ابوبکرؓ نے اس مقدس دعوت کو اپنے دل کی آواز سمجھ کر فوراً قبول کر لیا۔ وہ جرأت کا پیکر تھے۔ مظلوموں کی حمایت کے لیے سب کچھ قربان کر دیتے تھے۔ حضورؐ پر جان چھڑکتے تھے۔ خدشات و خطرات کے مواقع پر آگے بڑھ کر ہر آزمائش کا مقابلہ کرتے تھے اور رسول خداؐ کے لیے ڈھال بن جایا کرتے تھے۔ وہ غار ثور میں بے دھڑک گھس گئے تاکہ کوئی موذی جانور ہو تو اس کا خاتمہ کر دیں اور حضورؐ کو کوئی گزند پہنچنے کا احتمال باقی نہ رہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ بیک وقت نہایت رحم دل اور انتہائی سخت گیر تھے۔ دینی شعائر کے احترام کے منافی ادنیٰ سی بات بھی گوارا نہ تھی۔ ایسا کرنے والے سے وہ آہنی ہاتھوں سے نمٹتے تھے جبکہ ذاتی دشمنوں کو نہ صرف بخش دیتے تھے بلکہ ان سے احسان کا برتاؤ فرماتے تھے۔ ان کی نگاہیں بڑی دوررس تھیں، فوراً معاملے کی تہ تک پہنچ جاتی تھیں۔ وہ ہر دلعزیز تھے۔ آنحضرتؐ انہیں بے حد عزیز رکھتے تھے۔ دوسری طرف عام مسلمان بھی انتہائی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان کی شخصیت میں صبر و تحمل کی شان بھی بہت نمایاں تھی۔ صحابہ کرامؓ کے لیے وہ قیامت کا دن تھا جب آنحضرتؐ نے رحلت فرمائی۔ اس لمحے حضرت عمرؓ جیسے صاحب عزیمت صحابی بھی فرط غم سے نڈھال ہو گئے اور دامن توازن کھو بیٹھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اس موقع پر نہ صرف خود ثابت قدم رہے بلکہ انہوں نے دیگر صحابہؓ کو بھی صبر جمیل کی راہ دکھائی۔ سقیفہ بنی سعدہ میں انہوں نے جس سیاسی تدبر کا ثبوت دیا اس پر تاریخ اسلام ان کی ہمیشہ شکر گزار رہے گی۔ انہوں نے امت مسلمہ کو اس وقت تتر بتر ہونے سے بچایا جب آنحضرت ﷺ کے وصال کی اطلاع پا کر اسلام کے تمام کھلے اور چھپے دشمن اپنی کمین گاہوں سے نکل آئے تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے رسالت مآب کے جانشین اور مسلمانوں کے خلیفہ اول کی حیثیت سے اپنے فرائض انتہائی جرأت، فراست اور استقامت کے ساتھ ادا کیے۔ انہوں نے صرف سوا دو سال میں پورے جزیرہ عرب کو اسلام کا قلعہ بنا دیا۔ عراق فتح کیا اور مسلمانوں کا لشکر جرار شام کی طرف روانہ کر دیا۔

مولانا اصلاحیؒ نے صدیق اکبرؓ کی سیرت و شخصیت کا حال پورے دلائل کے ساتھ اس طرح بیان

کیا ہے کہ اسے جو بھی پڑھے گا، اس کے دل میں اچھا اور بڑا مسلمان بننے کی لگن اور استعداد پیدا ہو جائے گی۔

دوسرا مقالہ 'نظم قرآن' پر ہے۔ بظاہر قرآن کریم کے مضامین اپنے سیاق و سباق میں بے جوڑ نظر آتے ہیں مگر علمائے حق کی دوررس اور جزئیات بین نگاہوں کا فیصلہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی آیات مقدسہ میں ایک دلکش داخلی ربط و نظم موجود ہے جس میں ایک جہان معنی آباد ہے۔ برصغیر میں اس زاویہ نگاہ سے قرآن کریم کے علوم عالیہ پر کام کرنے کا اعزاز مولانا حمید الدین فراہیؒ کو حاصل ہے۔ جسے ان کے عظیم شاگرد مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے اپنے علم و نظر، ژرف نگاہی اور محنت شاقہ سے معتدبہ اضافوں کے ساتھ آگے بڑھایا اور سالہا سال کی جستجو کا ماحصل ''تدبر قرآن'' کی شکل میں پیش کر دیا۔ مولانا اصلاحیؒ نے اپنے جلیل القدر استاد کی رہنمائی میں نظم قرآن کی جو منور حقیقت دیکھی مرحوم نے بے اختیار چاہا کہ اس جلوہ حقیقت پر عام قاری کی نگاہ بھی جم جائے اور وہ قرآن کریم کی ایک بہت بڑی حقیقت سے مستفید ہو۔ اس لحاظ سے 'نظم قرآن' اپنے موضوع پر بڑا چشم کشا مقالہ ہے۔ اس کے مطالعے سے قرآن فہمی کی نئی جہات سامنے آتی ہیں۔

تیسرے مقالے میں 'مولانا حمید الدین فراہیؒ اور علم حدیث' مولانا کا صحیح مسلک اور مولانا عبیداللہ سندھی کی روایات کے زیر عنوان اظہار خیال کیا گیا ہے جس میں مولانا اصلاحی نے اپنے استاد گرامی کے دینی اور علمی نقطہ نظر پر روشنی ڈالی ہے۔ چوتھا مقالہ دراصل ایک انٹرویو ہے۔ اس میں مولانا اصلاحی نے جماعت اسلامی اور تنظیم اسلامی سے اپنے تعلق اور ترکِ تعلق کے اسباب و بواعث کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ مولانا اصلاحیؒ بنیادی طور پر جویائے علم اور داعی حق تھے۔ ان کی پوری زندگی اس حقیقت کی گواہی دیتی ہے کہ انہیں تلاش حق سے زیادہ کوئی چیز کبھی عزیز نہیں رہی۔

پانچویں مقالے کا تعلق محترمہ بیگم سلمیٰ تصدق حسین کے پنجاب اسمبلی میں پیش کردہ ایک مسودہ قانون سے ہے۔ بیگم صاحبہ پاکستان کی متحرک تاریخ تھیں۔ مرحومہ کا خیال تھا کہ مردوں کو چار شادیوں کی عام اجازت ہے۔ اس اجازت سے اکثر مرد ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ من پسند لڑکی سے بیاہ رچا لیتے ہیں اور پہلی بیوی کے حقوق و مفادات پامال کر دیتے ہیں۔ انہی محسوسات کے پیش نظر مرحومہ نے ۱۹۵۴ء میں پنجاب اسمبلی میں ایک مسودہ قانون پیش کیا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ مردوں کے لیے چار شادیوں کی اجازت عدالت کی اجازت سے مشروط کی جائے۔ یعنی نکاح ثانی کے شائقین عدالت سے رجوع کریں اور عدالت کو تفصیل اور وہ اسباب بتائیں جن کے پیش نظر وہ پہلی بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کی ضرورت

محسوس کرتے ہیں۔ اگر وہ عدالت کو اپنی ضرورت کے جواز سے مطمئن کر دیں تو عدالت عقد ثانی کا اجازت نامہ جاری کر دے۔ بصورت دیگر عقد ثانی کی اجازت نہ دی جائے۔

مولانا اصلاحیؒ نے اپنے علمی وقار اور بیگم صاحبہ کے مخلصانہ جذبات ملحوظ رکھتے ہوئے اس مسودہ قانون کا ناقدانہ جائزہ اس خوبی سے کیا ہے کہ ضمناً تعدد ازدواج اور طلاق جیسے عائلی معاملات اسلامی تعلیمات کی روشنی میں واضح ہو کر بالکل بے غبار ہو گئے ہیں۔ یہ مقالہ تجدد پسند، مغرب زدہ خواتین کے لیے خاص طور پر پڑھنے کی چیز ہے۔ اسکے مطالعے سے ان پر اسلام کے پاکیزہ عائلی ضابطوں اور قاعدوں کی حقیقت روشن ہوگی اور انہیں معلوم ہو جائے گا کہ خواتین کی فلاح، حرمت اور حقوق کا حقیقی ضامن صرف اسلام ہے۔

اسلام عصمت وعفت کی حفاظت کو زبردست اہمیت دیتا ہے۔ اس بحث میں مولانا اصلاحیؒ نے تعدد ازدواج کے بارے میں اسلام کا حکیمانہ نقطہ نظر بڑی خوبی سے واضح کر دیا ہے۔ انہوں نے خبردار کیا ہے:

> ''جس معاشرے نے یک زوجگی کے اصول کو شدت کے ساتھ اپنایا ہے، اس کو زنا کا دروازہ پوری وسعت کے ساتھ لازمی طور پر کھلا رکھنا پڑا ہے۔ امریکہ اور یورپ کے ملکوں میں ایک بیوی کے ہوتے ہوئے کسی شخص کے لیے دوسرا نکاح کرنا بہت بڑا جرم سمجھا جاتا ہے لیکن زنا وہاں شاید نکاح سے بھی زیادہ پاکیزہ سمجھا جاتا ہے۔ اس وجہ سے اگر ان کی تقلید میں، یک زوجگی کے قانون کو اپنانے پر اصرار ہے تو پھر دوسرے پہلو میں بھی پوری فراخ دلی کے ساتھ ان کی پیروی کرنی پڑے گی''۔ (ص ۱۲۷)

مقالات اصلاحی جلد دوم پڑھنے کی چیز ہے۔ سارے ہی مقالے علمی شہ پارہ ہیں۔

نام کتاب	قیمت
تالیفات امام حمید الدین فراہیؒ	
مجموعہ تفاسیر فراہی	328/-
تفسیر قرآن کے اصول (ترجمہ مولانا خالد مسعودؒ)	80/-
حکمت قرآن (ترجمہ مولانا خالد مسعودؒ)	96/-
تالیفات مولانا امین احسن اصلاحیؒ	
تدبر قرآن ۔۔۔ کامل (9 جلد)	2952/-
تدبر قرآن (فی جلد)	328/-
تدبر حدیث ۔۔۔ شرح امام مالکؒ	350/-
تدبر حدیث ۔۔۔ شرح صحیح بخاری	360/-
مبادیٔ تدبر قرآن	120/-
مبادیٔ تدبر حدیث	105/-
حقیقت شرک و توحید	165/-
حقیقت نماز	60/-
حقیقت تقویٰ	60/-
تزکیۂ نفس ۔۔۔ کامل	285/-
تزکیۂ نفس ۔ جلد دوم	120/-
دعوت دین اور اس کا طریقہ کار	120/-

نام کتاب	قیمت
اسلامی قانون کی تدوین	90/-
اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل	90/-
اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام	120/-
قرآن میں پردے کے احکام	15/-
فلسفے کے بنیادی مسائل ۔۔۔ قرآن حکیم کی روشنی میں	138/-
تفہیم دین	105/-
مقالات اصلاحی (جلد اول)	195/-
اصول فہم قرآن	34/-
مقالات اصلاحی (جلد دوم) زیر طبع	--
اسلامی ریاست (زیر طبع)	--
تالیفات مولانا خالد مسعودؒ	
قرآن حکیم (سٹینڈرڈ ایڈیشن) (مع ترجمہ اور اخذ و تلخیص تفسیر تدبر قرآن) ترجمہ: مولانا امین احسن اصلاحی، حواشی: مولانا خالد مسعود	550/-
قرآن حکیم (حمائل ایڈیشن)	396/-
حیات رسول امیؐ	375/-
اسباق نحو	36/-

ملنے کے پتے:

- **ادارہ تدبر قرآن و حدیث**، رحمان سٹریٹ، مسلم کالونی سمن آباد لاہور
- **فاران فاؤنڈیشن** 122۔ فیروز پور روڈ، اچھرہ، لاہور۔ 54600 فون: 042-7595200
- **دار التذکیر** رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور